رات کی روشنی

ظہیر بابر

رات کی روشنی

ظہیر بابر

مینو

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کلب کی روشنیاں ڈھلتی رات کا ساتھ دیتی تھیں' شراب قانوناً حرام نہیں تھی' کلب کی اونچی منقش چھت میں انگریز افسروں اور ان کی لیڈیز کے قہقہے محفوظ تھے اور اس کے ڈانس ہال کے فرش میں ولایتی ایڑیوں کی دھمک باقی تھی' رقص تو ان دنوں بھی ہوتا تھا مگر اس کی سج دھج ختم ہو گئی تھی البتہ کلب میں گھومتے چکراتے رنگ اب بھی قوس وقزح کے حریف تھے۔

مینو سیٹھ نجیب کا بازو تھامے کیا آئی تھی ساون کی گھٹا کی طرح کلب پر چھا گئی تھی حسن کوئی جو حسین سے حسین عورت کو بھی میسر نہیں تھی۔ اس کا حسن دیکھا ہی نہیں محسوس بھی کیا جا سکتا تھا۔ وہ ہنستی تھی تو یوں لگتا جیسے پھولی ہوئی سرسوں کے کھیت پر صبح دم دھوپ پھیل گئی ہے اور پھولوں اور پتوں پر ٹکے ہوئے اوس کے قطرے موتی بن کے چمکنے لگے ہیں۔ میں کلب کے ایک گوشے میں بیٹھ کر کئی دن سوچتا رہا کہ اس کے حسن کا وہ کون سا اضافی زیور ہے جو اسے کلب کی نہایت خوبصورت عورتوں میں بھی ممتاز کر دیتا ہے؟ اس کی ہنسی' اس کے بالوں کی وہ لٹ الٹ کر تاج بن گئی تھی' وہ ہلکی سی سلوٹ جو بولتے ہیں اس کے دائیں گال پر ابھرتی ڈوبتی رہتی تھی یا اس کے ت اور ٹ کہنے کا انداز جس میں اس کی زبان دانتوں کے نیچے آتے آتے بچتی تھی؟ مگر ایسی باتیں ہر ایک کے دل میں تو نہیں کھب سکتیں!

میں نے اس آنکھیں دیکھیں' بڑی بڑی اور روشن جن سے مسرت اور اعتماد ابلا پڑتا تھا۔ جن کی گہرائی وہی ناپ سکتا تھا جو تھوڑی دیر اس سے آنکھیں ملا سکے۔ میں نے سوچا کہ اس کی آنکھوں نے ہی سب کو مسحور کر لیا ہے۔ پھر میں نے اس کے ہونٹ دیکھے' ترشے ہوئے یاقوت لگتے تھے۔ اس کا نچلا ہونٹ ذرا بھاری تھا' میں نے طے کیا کہ اس کے نچلے ہونٹ میں اس کی اضافی کشش کا راز چھپا ہوا ہے' پھر غور کیا تو معصومیت اس کے چہرے کے خدوخال کا حصہ تھی مگر معصومیت کے بغیر تو حسن مکمل ہی نہیں ہوتا' پتھروں کو بھی تراش کر ان میں ملائمت کا اثر پیدا کیا جاتا ہے' تب کہیں وہ ایسے بت بنتے ہیں' جن کی پیار سے پوجا ہوتی ہے۔ میں نے اس کی قدوقامت پر اپنی نظر گھمائی تو اس میں وہی توازن پایا جو کائنات میں ہے وہ چلتی تو ایسا لگتا کہ مست ہوائیں مشعلیں لئے اس کے آگے چل رہی ہیں۔ اس کی آواز کو جانچا تو ایسے لگا جیسے کوئی راگ مست ستار بجا رہا ہے۔ اس کی آواز اپنے پیچھے ایسی کھنکتی ہوئی گونج چھوڑ جاتی تھی جو صرف گنبد ہی پیدا کر سکتا ہے اور گنبد تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ جائزہ لیتے ہوئے مجھے کئی بار ایسا لگا جیسے میری آنکھیں اسے دیکھنے سے کترا رہی ہیں' جیسے اس کا حسن ناقابل برداشت ہے۔ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے مکمل حسن کا بھی اسی طرح اعتراف کر لینا چاہیے

جس طرح ہم پریوں اور حوروں کے حسن کا یقین کر لیتے ہیں۔

پہلے روز وہ سبز چینی سلک کی میکسی پہنے تھی جس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے گلاب کے پھولوں کے تختے پر کسی نے یونانی دیوی کا سر رکھ دیا ہے۔ یہ احساس مجھ تک محدود نہیں تھا' کلب میں دھڑکنے والے ہر دل پر نقش ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے تو آپ پوچھیں گے کہ سیٹھ نجیب کون تھا جس کے کندھے سے لگ کر مینو نے کلب میں قدم رکھا تھا؟ سیٹھ نجیب ملک کا ابھرتا ہوا کامیاب صنعت کار اور بہت بڑا تاجر تھا۔ اس نے بہت سی زمین بھی خرید رکھی تھی اور وہ جدی پشتی جاگیرداروں کی طرح مزارعوں کو اپنی رعیت کہتا تھا کلب میں کچھ لوگ اسے پارس سمجھتے تھے کہ پتھر کو بھی ہاتھ لگاتا ہے تو وہ سونا بن جاتا ہے بعض لوگ اسے برگد کا درخت بتاتے تھے جو ہوا میں سے بھی دولت کشید کر لیتا ہے اور جس کی ظاہری اور باطنی جڑوں کو شمار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے بے شمار مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ ہر تیسرے چوتھے مہینے وہ ایک خوبصورت لڑکی کو بازو میں لئے کلب میں آتا اور اپنی ''گرل فرینڈ'' کے طور پر اس کا تعارف کراتا۔

سیٹھ نجیب کنوارا نہیں تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک سے گھر والوں نے اس وقت شادی کر دی تھی جب وہ نجیب زیادہ اور سیٹھ کم تھا۔ دوسری شادی اس نے اپنی پسند کی تھی۔ پہلی بیوی کو اس بناء پر طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا کہ اس نے اگر کسی ایرے غیرے سے دوسری شادی کر لی تو اس کی عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔ مگر وہ بڑا منصف مزاج تھا۔ اپنے دونوں گھروں پر برابر کی توجہ دیتا تھا دونوں بیویوں کے لئے الگ الگ شاندار بنگلے تھے جن کی چار دیواری جیل کی دیواروں سے بھی اونچی تھی۔ اس نے دونوں کو ایک جیسی لمبی کاریں دے رکھی تھیں' جن کی پچھلی نشستیں ہر دم برقعے میں رہتی تھیں۔ اس کے پاس پہرے داروں کی ایک فوج تھی' غنڈے' مشٹنڈے' اجرتی قاتل' وہ سیٹھ نجیب کی ملوں میں مزدوروں کو اس کے کھیتوں میں مزارعوں کو اور کلب میں اس کے بڑے بڑے حریفوں کو دہشت زدہ رکھتے تھے۔ اس کے دونوں گھر میں کام کرنے والی عورتیں اس کے ملازموں یا مزارعوں کی بیویاں اور بیٹیاں تھیں۔ اس کا ایک تیسرا گھر بھی تھا۔ ایک وسیع و عریض قلعہ نما بنگلہ' جس کے پورچ میں نئے نئے ماڈل کی گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ یہ بات اس کے ڈرائیوروں کو بھی معلوم نہیں ہوتی تھی کہ وہ کس وقت کون سی گاڑی استعمال کرے گا اور رات کس گھر میں گزارے گا؟

سیٹھ نجیب صاحب اولاد بھی تھا اور اپنے بچوں سے بے حد پیار کرتا تھا۔ اس کے پیار کا اظہار شاہانہ تھا۔ اس کے ہر بچے کے نام

سے ایک کارخانہ چل رہا تھا۔لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ نجیب کے بچے ہاتھ میں ایک مل لے کر پیدا ہوتے ہیں۔پلوٹھی کے بیٹے کے سوا ہر بچے کی پہلی سالگرہ کارخانے کو چالو کر کے منائی گئی تھی۔اس تقریب میں شہر کا ہر وہ شخص مدعو ہوتا جو معزز سمجھا جاتا تھا مگر وہاں نہ وہ بچہ موجود ہوتا' جس کے نام پر کارخانے کا نام رکھا جاتا تھا اور نہ اس کی ماں' افتتاح کی تقریب کا دوسرا حصہ کلب میں منایا جاتا۔ اس شام کلب کا ہر ممبر سیٹھ نجیب کا مہمان ہوتا اور ہر جام سیٹھ نجیب کی صحت اور خوش نصیبی کے لئے دعا بن جاتا۔اس موقع پر کلب میں طرح طرح کے کھانے بھی سجائے جاتے مگر وہ عام طور سے بیرے اور ان کی اولادیں کھاتیں اور سیٹھ نجیب کی نسل میں اضافے کی دعائیں مانگتیں۔کلب کے ممبر تو وسکی پی پی کر ہی بے دم ہو جایا کرتے تھے۔

سیٹھ نجیب ویسے بڑا خدا ترس اور نیک دل آدمی تھا۔اس کے چندے سے کئی مسجدیں مکمل ہوئی تھیں اور کئی دارالعلوم اور یتیم خانے چل رہے تھے۔عید' بقر عید کے موقع پر اکثر مساجد میں خطیب بڑے خلوص سے اسے اور اس کے بزرگوں اور اولادوں کو اجتماعی دعائیں شریک کرتے اور وہ نمازی بھی رواداری میں با آواز بلند آمین کہہ دیتے تھے جنہوں نے سیٹھ نجیب کی صورت تو کیا کبھی اس کی موٹر بھی نہیں دیکھی تھی۔وہ محتاجوں' یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنے میں بھی بڑا فراخدل تھا۔اس کے پیسوں سے کئی گھروں کے چولہے گرم رہتے تھے مگر اس سخاوت کی وہ نمائش نہیں کرتا تھا۔خاموشی اور رازداری کو وہ خیرات کا حصہ سمجھتا تھا شاید اسی لئے امداد پانے والوں میں مشہور تھا کہ اس کے چہرے پر نور برستا ہے اور وہ بڑا ہی وجیہہ آدمی ہے۔حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔وہ بیچارا تو خاصہ کم صورت تھا چہرہ لمبوترا اور ناک ستواں ہوتے ہوتے پچیل کے مڑ گئی تھی۔آنکھیں چھوٹی اور کان بڑے تھے اور رنگ دبتا ہوا تھا۔اس کے قد کے مقابلے میں اس کا سر چھوٹا تھا اور نئے نئے کارخانوں اور کاروباروں کے لئے سوچ بچار نے اس کے سر کے بیشتر بال غائب کر دیئے تھے۔اس کی چال البتہ غضب کی تھی۔وہ لقے کو کبوتر کی طرح سینہ تان کر یوں چلتا تھا جیسے اس کا پاؤں زور سے پڑا تو زمین بیٹھ جائے گی۔اس کا لہجہ دھیما اور آواز بہت اچھی تھی۔اسے سلیقے سے بات کرنے کا ڈھنگ آتا تھا اور وہ اکثر موضوعات پر بڑے اعتماد سے گفتگو کرتا تھا۔اس کی عام معلومات بھی خاصی وسیع تھیں مگر اہم افراد کے بارے میں تو حیرت انگیز حد تک مکمل ہوتی تھیں۔ایسا لگتا تھا کہ وہ ملک کے ہر قابل ذکر شخص کے ساتھ سایہ بن کر چلتا تھا۔

بہت سی دولت سمیٹ لینا بھی ایک بہت بڑا کمال ہے مگر میری نظروں میں سیٹھ نجیب کا سب سے بڑا کمال اس کا نوعمر کھلاڑی جیسا جسم تھا' جس کا وزن اس نے ایک نقطے پر پابند کر رکھا تھا۔بلانوشی کے باوجود اس کے پیٹ پر ہلکا سا گنبد بھی نہیں ابھرا تھا۔اس کی کمر جیسے چیتے چرائی گئی تھی۔اس کا جسم دیکھ کر تھل تھل کرتی ہوئی توندوں والے جاگیردار اور چربی کی تہوں میں پھنسے ہوئے سیٹھ بخت جلتے

تھے مگر اس کے جسم کی شائستگی اور خوش وضعی کا کھوج لگانے سے قاصر تھے انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سیٹھ نجیب نے وہ کونسا موہنی منتر پڑھ رکھا ہے جو ہر تیسرے مہینے اپنے بازو میں ایک حور شمائل ٹانک لے کر آتا ہے۔ دولت تو ان کے پاس بھی تھی اور وہ عورت پر خرچ کرنے کو بھی تیار تھے مگر انہیں عام طور سے سڑی بسی طوائفیں ہی ملتی تھیں' وہ کم بخت بھی ان کے سامنے یوں منہ بنا کے بیٹھی تھیں جیسے نوٹوں کی ضرورت نہ ہوتی تو انہیں ناک سے پکڑ کر دو چار پٹخنیاں دے دیتیں۔ آخر طوائف کی آنکھوں میں بھی نور ہوتا ہے۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ سیٹھ نجیب سے کلب کے اکثر ممبر دل ہی دل میں سخت جلتے تھے اور اس کی ہر گرل فرینڈ سے ان کی بیویاں' اکثر عورتیں تو انہیں ایسی خونخوار نظروں سے دیکھتی تھیں کہ ان کا بس چلے تو انہیں قتل ہی کر ڈالیں مگر جب سے مینو آئی تھی' میں نے کسی بیوی کو مینو سے بات کرنے پر اپنے شوہر کو گھورتے ہوئے نہیں دیکھا تھا جب سے انگریز ممبر گئے تھے اور کلب کا انتظام دیسی ہاتھوں آیا تھا۔ نو دولتئے اور چھٹ بھیئے قسم کے ممبروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو گئی تھی۔ ایسے ڈرامے ایک معمول سا بن گئے تھے کہ بیوی نے اپنے شوہر کی کسی غیر عورت سے پھسل پھسل کر باتیں کرتے دیکھا تو اسے یوں گھسیٹ کر لے گئی جیسے آوارہ بیل کو ہانک کر کانجی ہاؤس میں بند کر دینا چاہتی ہے۔ کسی خاتون کا پارہ زیادہ چڑھ گیا تو اس نے اپنے شوہر کے سر پر ہینڈ بیگ جڑ دیا اور وہ ٹاؤں ٹاؤں کرتا اس کے پیچھے چلنے لگا۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا کلب کے قواعد کی رو سے ایک ایسا جرم تھا جس کی معافی نہیں مل سکتی تھی۔ اس قاعدے سے چند خوبصورت جوان خواتین فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ اس ٹولی کا یہ مشغلہ تھا کہ پہلے تو اپنے اوپر ریجھے ہوئے آدمی کو ڈھیل دیتیں اور جب وہ نشہ خطمی ہونے لگتا تو ایسی ڈانٹ بتاتیں کہ ایک شام کے لئے تو وہ کلب میں نکو بن کر رہ جاتا۔ ان میں سے ہی ایک بے باک عورت نے تو حد کر دی تھی۔ پہلے اپنے شوہر کے بڑے افسر کو خوب رجھایا پرچایا اور جب وہ بزرگ حوصلہ پا کر ہاتھ پھیلانے لگا تو اس کے منہ پر اس زور سے طمانچہ رسید کیا کہ کلب کی عمارت گونج اٹھی تھی۔ بڑا افسر تو پتھر کا ہو گیا تھا مگر اس کی بیوی کے پھولے پھولے گالوں پر آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ یہ غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا سب لوگ جانتے تھے کہ نشہ تو محض ایک بہانہ تھا۔ یہ عورت دوسری خواتین کی طرح نہیں تھی۔ جو شیمپین کے ایک پیالے سے ہی سرشار ہو جاتی ہیں وہ تو وہسکی کے گلاس پر گلاس اس طرح طرح غٹ غٹ کر کے پی جاتی تھی جیسے جنم جنم کی پیاسی ہو۔ اس لئے کلب میں ایسی بدتہذیب عورت کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے شوہر کو لکھ کر کلب کی انتظامی کمیٹی سے معافی مانگنا پڑی تھی حالانکہ کمیٹی میں دو نہایت جونیئر افسر بھی شامل تھے۔ وہ شاید استانہ کرتا مگر اپنی جوان بیوی کو گھر میں تنہا چھوڑ آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور کلب سے مسلسل غیر حاضری اس کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔

مینو کے ساتھ نہ کبھی ایسا کوئی حادثہ پیش آیا اور وہ کسی طرح کا کردار بنی۔ جس طرح انتہائی بدصورتی اپنی محافظ آپ ہوتی ہے اسی طرح انتہائی خوبصورتی بھی اپنی حفاظت خود کرتی ہے۔ بس اس میں تھوڑا سا دبدبہ' تھوڑا سا طنطنہ اور آدمی کو پہچاننے کی تھوڑی سی صلاحیت ہونی چاہیے مینو کو یہ سب کچھ بھی اور انتہائی مطالعہ اور انتہائی ذہانت بھی میسر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چاہے کتنی ہی دیر مردوں کی محفل میں ہنس ہنس کے باتیں کرتی رہے' نہ کوئی مرد حسد سے بڑھتا اور نہ کسی عورت کے ماتھے پر ہی شکن ابھرتی سب عورتیں پہلے ہی دن جان گئی تھیں کہ وینس کے اس بت کے سامنے ان کے مرد بونے ہیں۔ وہ اس کے پاؤں میں ہی گھوم پھر کر واپس آ جائیں گے وہ اپنے آپ کو یوسف ثانی سمجھتے رہیں مگر ان میں کوئی ایک بھی سیس یا ایڈوانس نہیں ہے' جس پر وینس دم بھر کو مرمٹے! بارہا ایسا بھی ہوا کہ چند عورتوں نے مینو کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور یوں لہک لہک کر اس سے باتیں کرنے لگیں جیسے وہ سب مرد ہوں اور ایک حسینہ کی چشم عنایت کی طلب میں اس کے سامنے بچھے چلے جا رہے ہوں۔ عورتیں عام طور پر سے کسی بہت خوبصورت عورت کے قریب جانے سے کتراتی ہیں کہ کہیں اس کی وجہ سے کم صورت نہ لگیں مگر مینو تو اپنی جیسی ایک ہی تھی۔ اس لئے کسی کو موازنہ کرنے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے چند روز میں اپنے اردگرد اعتماد کا ایک ہالہ بھی بن لیا تھا کئی عورتیں اس کے سامنے اپنے دل کی بات اور دوسروں کے ڈھکے چھپے سکینڈل بلا تکلف بیان کر دیتی تھیں۔ وہ راز فاش کرنے سے پہلے یہ رسمی ہدایت دہرانا بھی بیکار سمجھتی تھیں کہ دیکھو مینو یہ بات اپنے تک رکھنا ان سب کو نہ جانے کیوں یقین تھا کہ مینو کا سینہ ایک ایسا لاکر ہے جو ٹوٹ سکتا ہے مگر کھل نہیں سکتا!

مینو بہت جلد کلب کے سب لوگوں میں گھل مل گئی تھی۔ اس کی آمد کا انتظار رہتا تھا اور اس سے دو باتیں کر کے لوگ خوش ہو جاتے تھے کلب میں کارڈ ہوم بھی بلیئرڈ روم کی طرح خاموش رہتا ہے۔ اس میں سر شام کلاس سی لگ جاتی ہے۔ ایک ایک میز کے گرد تین تین چار چار آدمی تاش کے رنگ برنگے پتے پکڑے اصحاب کہف کی طرح دم بخود بیٹھے ہوتے ہیں۔ برج میں بیس روپے پوائنٹ سے کم پر کوئی نہیں کھیلتا تھا' پوکر میں تو پتے پتے پر پیسے لگتے ہیں اور فلاش میں بلف کرنا بھی ایک ذہنی عمل ہے اس کے لئے خاموشی اور سکون چاہیے ہوتا ہے مگر مینو جونہی کارڈ روم میں قدم رکھتی تو ایسی ہلچل سی مچ جاتی جیسے کلاس روم میں آدھی چھٹی کی گھنٹی گونج اٹھی ہے۔ بعد میں بعض کھلاڑی شاید دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتے ہوں مگر اس کے سامنے سب کی باچھیں کھلی رہتی تھیں۔ وہ جب تک کارڈ روم میں رہتی تھی سب اپنی بولیاں بھول کر اس کی باتوں اور قہقہوں کا رس پیتے رہتے۔ کلب میں بڑے بڑے پھکڑ قسم کے لوگ بھی تھے مگر مینو کو قریب پا کر ان پر تمیز کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ وہ ایسی شائستہ گفتگو کرنے لگتے تھے جیسے ان کی زبان آب زمزم میں دھلی ہوئی ہے۔ شروع میں ایک آدھ آدمی نے کہا مینو رانی انھیں کیا خبر وسکی جب ذہن کو جسم کے پنجرے سے آزاد کر دیتی ہے تو کتنی فرحت ہوتی ہے مگر تم

نے تو کبھی پی ہی نہیں وہ نشے میں بھی اسے کم بخت نہ کہہ سکا تھا۔ ایک دوبار میں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ دو شخص ایک دوسرے پر شراب اچھال کر لڑنے مرنے کو کھڑے ہوگئے۔ ادھر سے مینو دھیمی دھیمی مسکراہٹ لئے آتی اور وہ دونوں اس طرح اپنے ہاتھ ملنے لگے جیسے کوئی بات نہیں ہے۔ واڈکا زیادہ پی گئے ہیں ہتھیلیاں جلنے لگی ہیں۔

اور تو اور مینو کی آمد کے ساتھ سیٹھ نجیب بھی بہت بدل گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنی ہر گرل فرینڈ کو ڈھیل دیتا تھا۔ اسے پتنگ کی طرح اپنی مرضی کے حلقے پر اڑاتا تھا اور اس کی چہلوں اور غمزوں سے خوش ہوتا تھا مگر مینو کے معاملے میں اس کا دل بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔ وہ اسے ہر دم نظروں میں رکھتا تھا۔ بار کے کاؤنٹر کے سامنے ایک بہت بڑا آئینہ لگا ہوا تھا۔ اس میں پورے ہال کی فلم چلتی رہتی تھی۔ سیٹھ نجیب کو اب اس کا بھی اعتبار نہیں تھا۔ وہ گھوم کر مینو کو اپنی آنکھوں سے چلتے پھرتے اور باتیں کرتے دیکھتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ مینو گھومتی گھامتی کسی بغلی کمرے میں چلی گئی اور سیٹھ نجیب اسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا وہاں پہنچ گیا۔ ایسے موقع پر مینو اپنی بڑی بڑی آنکھیں سکیڑ کر دھیرے سے کہتی ایسی بھی کیا بے اعتباری؟ سیٹھ نجیب ایک لمبا گھونٹ بھرتا اور مینو اپنے جملے سے خود محظوظ ہوتی۔ شاید اسے یہ سستا سا جملہ ہر بار نیا لگتا۔ سیٹھ نجیب کی ان حرکتوں کی وجہ سے کلب میں یہ افواہ اڑی تھی کہ وہ بہت جلد مینو سے شادی کرنے والا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ افواہ سیٹھ نجیب نے اپنے آدمیوں کے ذریعے پھیلائی تھی تاکہ کوئی شخص مینو سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرے۔ سب کو معلوم رہے کہ مینو کی طرف جو ہاتھ بڑھے گا وہ جل جائے گا۔

تو ایسی تھی مینو مگر ابھی آپ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں بھی بس اتنا ہی جانتا تھا پھر وہ مجھ پر مہربان ہوگئی شاید اس لئے کہ میری نظروں میں وہ پیاس نہیں تھی جو بہت سے دوسرے لوگوں کی بے بس آنکھوں سے رال کی طرح ٹپکتی رہتی تھی یا پھر اس لئے کہ میں اس وقت کلب میں قدم رکھتا تھا۔ جب کلب کے در و دیوار بھی مست ہو کر جھوم رہے ہوتے تھے اور اکثر بھلے چنگے آدمی ہکلانے لگتے تھے۔ مینو کو ان کی باتیں مصنوعی اور احمقانہ لگتی تھیں۔ پھر بھی انہیں یہ کہہ کر وہ نظر انداز کر دیتی تھی کہ بیچارے گھڑی دو گھڑی کو خوش ہو لیں کل پھر انہیں دن کی چکی میں پسنا ہوگا۔ ان دنوں کسی عرب شاعر کا یہ مصرعہ کلب کا تکیہ کلام بن گیا تھا کہ اٹھ کہ جبار سموت کی نافرمانی کریں۔ اسے سن کر مینو کا چہرہ ذرا سا متغیر ہوتا تھا پھر وہ مسکرا کر دوسری طرف دیکھنے لگتی تھی۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ کلب میں کچھ دنوں کے لئے 'شیلے' کیٹس وغیرہ آزادی کی لہر میں ڈوب گئے تھے چیئرز کی جگہ السلام علیکم نے لے لی تھی اور فارسی اور اردو کے اشعار سنانے کا سلسلہ چلا تھا مگر مشکل یہ ہوئی کہ جو کوئی شعر سناتا اسے عموماً اس کی تشریح بھی کرنا پڑتی اور تشریح اتنی بھونڈی ہوتی کہ سننے والے اسے لطیفہ سمجھ کے خوب ہنستے' اس لئے سخن فہم حضرات سامعین کی بدذوقی سے بہت جلد بیزار ہو گئے۔ وہ پھر سے

انگریزی کے شعر اور مقولے دہرانے لگتے کہ کوئی شخص بھی ان کی تشریح کا تقاضا کر کے اپنی جہالت کی تشہیر نہیں کر سکتا تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے میں اتنی دیر سے کلب میں کیوں جاتا تھا۔ مجھے دفتر سے فرصت ہی اسی وقت ملتی تھی کرائم رپورٹر کے سوا تمام رپورٹر شام کا کام ختم کر کے گھروں کو چلے جاتے تھے میرا چونکہ کوئی گھر نہیں تھا میں اکیلا تھا۔ اس لئے کلب کو میری رپورٹنگ بیٹ میں شامل کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے خانہ پری کے لئے چھوٹی موٹی خبر بھی مل جاتی تھی۔ کبھی کبھار ایک آدھ لانگ شاٹ سکوپ بھی ہاتھ لگ جاتا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اشتہار دینے والے سیٹھوں سے رابطہ قائم رہتا تھا۔ ان دنوں ایک اچھے اخبار کی یہ پہچان ہوتی تھی کہ وہ کسی کی پگڑی نہیں اچھالتا اور کسی کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دیتا اگرچہ جرائم کی خبروں کی لت فسادات نے لگادی تھی پھر بھی اخبار انہیں اس طرح ڈھکا چھپا کے اختصار کے ساتھ پیش کرتا تھا جیسے شرمسار ہے کہ اپنے قارئین کو صبح صبح گندی سی خبریں بھی سنا رہا ہے کسی سے اشتہار لینے یا انتقام لینے کے لئے بلیک میل کرنے کی رسم نہیں چلی تھی۔

بہر حال میں جب کلب میں قدم رکھتا تو عام طور سے یا تو بیرے ہوش میں ہوتے تھے یا مینو یا پھر میں! اس وقت مینو شاید اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کرتی تھی' اس لئے مجھے پاس بٹھا کے دنیا جہان کی باتیں کرتی تھی مگر اس کی گفتگو میں نہ تو کوئی گلہ ہوتا نہ کوئی شکایت اور نہ کوئی سکینڈل! کبھی کبھار اس کے منہ سے ایسے بے ضرر جملے نکل جاتے تھے' اس پیٹی والے کو دیکھو' پتہ نہیں چلتا۔ پیٹی سے اس نے اپنی شریر توند باندھ رکھی ہے یا اپنا تھیلا پتلون! شاہد ذرا اس کی پتلون کو چھیڑ کے دیکھو یہ کہہ کر وہ اس طرح ہنستی تھی جیسے پیٹی والے کی پتلون قدموں میں گر گئی ہے اور وہ اپنے پیٹ کی چٹان کے اوپر سے جھک کر اسے اٹھا نہیں سکتا یا کسی بد چال کو دیکھ کے وہ کہتی تھی بیچارے کی کولہے کی ہڈیوں کا جوڑ صحیح نہیں بیٹھا۔ کیسے چھدرا کے چلتا ہے۔ کسی کے لئے زیادہ سے زیادہ سخت بات جو میں نے اس کی زبان سے سنی تھی وہ ایک نودولتیئے کی نوجوان بیوی کے بارے میں تھی۔ اس کے جسم پر تو سونے کے زیور بھی تانبے کے ہو جاتے ہیں۔ کئی دنوں کے بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ ایسے جملے وہ محض موضوع بدلنے اور گفتگو کا رخ موڑنے کے لئے استعمال کرتی تھی۔ بس ایک بات تھی جو وہ چلتے چلتے روز دہراتی تھی دیکھو شاہد' خاصی رات ہوگئی ہے نجیب کو نہ اٹھایا تو وہ صبح تک پیتا ہی رہے گا اور اگر وہ پیتے پیتے مر گیا تو مجھ رکھیل کا کیا بنے گا؟

ایک دن میں نے کہا سیٹھ نجیب تم پر جان چھڑکتا ہے تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ کیوں رکھیل کہہ کر اپنے آپ کو اپنی نظروں سے گراتی رہتی ہو۔

جواب میں اس نے رس بھرا ہوا قہقہہ لگایا تھا جو کلب میں جلترنگ مشہور تھا۔ اسے سن کر مخمور ممبر بھی چونک اٹھتے تھے اور پھر ان

کے چہروں پر مسکراہٹ بے قابو ہو کر پھیل جاتی تھی۔ تم نجیب کی دو بیویوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ وہ سانپ کی طرح مڑے ہوئے سروں اور بھیڑیے کی سی طرح آنکھوں سے بے نیاز بول رہی تھی وہ بے چاریاں بھی گوشت پوست کی عورتیں ہیں۔ ان کے جسم میں روح اور دماغ میں خون دوڑتا ہے پتہ نہیں۔ وہ بھی کیا کچھ چاہتی ہوں گی؟ پنجروں میں بند پڑی سڑ رہی ہیں۔ نجیب ان کے پاس سے گزرتے ہوئے انہیں چمکار پچکار دیتا ہے اور دانہ پانی ان کے پنجروں میں پہنچ جاتا ہے بس یہی ہے ان کی زندگی۔

تم انہیں پنجرہ کہتی ہو وہ تو عالیشان بنگلے ہیں۔

پنجرہ تو پنجرہ ہی ہوتا ہے بڑا ہو یا چھوٹا' وہ تو مکان پورے پورے ملک اور پورے پورے براعظم پنجرہ بن جاتے ہیں۔ ان بیچاریوں کا حال سن کر مجھے وہ پرانی پینٹنگ یاد آ جاتی ہے۔ جس میں بن مانس قسم کا مردہ دکھایا گیا ہے۔ اس کی داڑھی اس کے سینے پر لوٹ رہی ہے۔ اس کی مونچھیں داڑھی میں گم ہیں اور اس کی گھنی بھنویں اس کے چھوٹے سے سر کے آوارہ بالوں میں مل گئی ہیں۔ وہ ایک ہاتھ میں خاردار ڈنڈا تھامے ہے اور دوسرے ہاتھ سے ایک عورت کو بالوں سے گھسیٹتا ہوا غار میں لئے جا رہا ہے۔ وہ اچانک بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ بالکل سپاٹ ہے بلکہ اس کے چہرے کا سکون دیکھ کے ایسا لگتا ہے' جیسے وہ کنکروں پر گھسیٹی نہیں جا رہی' اپنے محبوب کے ساتھ پھولوں کی سیج پر کروٹیں بدل رہی ہے۔ تم نے دیکھی ہے وہ تصویر؟ کبھی غور کیا ہے اس پر؟

شاید عورت کو اس انداز میں کیف اور سکون مل رہا ہو؟

کنکروں میں کیف؟ چھوڑ بچوں کی سی باتیں' رہے نا اخبار نویس کے اخبار نویس! اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا وہ تصویر ایک مرد نے بنائی ہے اور اس نے وہ ساری بھوک اور ہوس مرد کے چہرے آنکھوں میں اور انداز میں بھر دی ہے جو خود اس کے اندر ابل رہی تھی' عورت کو اس نے اپنی بھوک کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جیسے تلی ہوئی مچھلی' بھنا ہوا تیتر' بیئر کی بوتل۔

عورت کو بہرحال ایک مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے گفتگو کو اصل موضوع کی طرف پلٹنے کی کوشش کی۔

واہ کیا بات ہے۔ مینو نے چمک کر کہا جیسے مرد کو عورت کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شاہد ذرا سوچو تو دنیا میں چڑیا سے زیادہ کمزور کون ہوگا؟ کبھی دیکھا ہے تم اسے ایک چڑے کے پروں سے عمر بھر کے لئے بندھا ہوا؟ وہ اپنے پروں پر اڑتی ہے۔ سارے پرندے اپنے پروں پر اڑتے ہیں' اگر ان سب کے پر باندھ دیئے جائیں تو ان کا وجود ہی ختم ہو جائے' کتے بلیوں کی عید ہو جائے۔

میں حیران تھا کہ مینو آج کیسی باتیں کر رہی ہے۔ چڑیا اور انسان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میں اکتائے ہوئے کمہار کی طرح ناخن

سے مٹی کھودنے لگا۔

فرق! انسان اور چڑیا میں صرف یہی فرق ہے کہ انسان اس دنیا کا احمق ترین جانور ہے' اسے پھانسنے کے لئے چار دانے بہت ہیں' جال پھیلانے کی ضرورت ہی نہیں ہے' اس نے اپنے لئے بے شمار کولہو خود ہی تیار کئے ہیں مضبوط رسے بٹے ہیں اور انہیں خود ہی باندھ کر کولہو میں جت گیا ہے ایک ہی دائرے میں چکر کاٹ کاٹ کر عمر گزار دیتا ہے۔ اسے تو مرتے وقت بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ زندگی اور عقل کی شکل میں خدا نے اسے جو نعمت عطا کی تھی وہ اسے بالکل ضائع کر کے جا رہا ہے پتہ نہیں وہ خدا کے سامنے اس کفران نعمت کی کیا توجیہہ کرے گا! وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

تم اصل سوال ٹال رہی ہو۔ مرد اور عورت مل کر ہی زندگی کی گاڑی چلاتے ہیں یہ دلیل سن کر مینو مسکرا دی پھر چڑانے کے انداز میں نرمی سے کہا۔ شاہد تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ تم دنیا کے بارے میں بہت سی باتیں نہیں جانتے' تمہیں معلوم نہیں ہے کہ جب محض شادی کے ذریعے دو پہیے جوڑے جاتے ہیں تو اکثر دولت مند مرد وحشی اور رہا کشش ہی نہیں شکی اور حاسد بھی بن جاتے ہیں وہ اتنا بڑا پہیہ ہوتے ہیں کہ دو تین تین پہیے مل کر بھی ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ رہے غریب تو وہ اپنی بیویوں کی محنت کی کمائی بھی ہتھیا لیتے ہیں اور ان سے اپنی ان گنت محرومیوں اور پیاسی حسرتوں کا انتقام بھی لیتے ہیں' کبھی انہیں روئی کی طرح دھن کر اور کبھی ان کی ہڈیاں چھوڑ کر' ان بیچاریوں کو تو پورا کھانا بھی نہیں ملتا۔ پہلا بچہ پیٹ میں آنے کے بعد موت کے گدھ ان کے سروں پر منڈلانے لگتے ہیں۔ برابری کا درجہ انہیں بھی کوئی فرق نہیں دیتا۔ محبت کے بغیر شادی کے دو پہیے برابر سے نہیں جوڑے جا سکتے وہ تو زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے کی بجائے ایک ہی جگہ گھوں گھوں کرتے رہتے ہیں۔ اگر محبت میسر نہیں ہے تو پھر یہ رکھیل کے مزے ہیں کہ وہ تو خود ہر بندھن سے آزاد رہتی ہے اور مرد کو قید رکھتی ہے اس نے ہال میں لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک کا پینڈولم بھی مینو کی منطق پر سر پیٹ رہا تھا۔ شاہد! خاصی رات ہو گئی ہے نجیب کو نہ اٹھایا تو وہ صبح تک پیتا ہی رہے گا اور اگر پیتے پیتے مر گیا تو مجھ رکھیل کا کیا بنے گا؟ وہ اپنی بات پر خود ہی مسکرائی اور اٹھ کر نجیب کی طرف چلی گئی میں بیٹھا سوچتا رہا۔ عجیب عورت ہے نہایت ذہین بھی ہے اور نہایت احمق بھی اسے احساس ہی نہیں ہے کہ سورج کے غروب ہونے کے ساتھ زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ زندگی کی رات بھی بسر کرنا ہوتی ہے جب اس کی آنکھوں کے گوشوں میں عمر کی مکڑی جالے بنے گی اور اس کے دانت مسوڑھے چھوڑنے لگیں گے تو نجیب ایسے لوگ اسے ماچس کی خالی ڈبیا کی طرح چلتی کار سے سڑک کے کنارے پھینک دیں گے۔ وہ چکراتی ہوئی فٹ پاتھ پر جا گرے گی اور راہ گیروں کے پاؤں تلے کچلی جائے گی۔

پھر یہ سوچ کر میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا کہ ایک چوہا نگلنے کے بعد سانپ کو ہفتہ بھر بھوک نہیں ستاتی' وہ نہ جانے اب تک کتنے چوہے نگل چکی ہوگی؟ میں نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا مینو سیٹھ نجیب کو سہارا دے کر لئے جا رہی تھی۔ وہ اتنی احتیاط سے چل رہا تھا جیسے اندھیرے میں سیڑھیاں اتر رہا ہے۔ میری نظروں کے سامنے دونوں کا سایہ بڑی دیر تک دروازے سے چپکا رہا تھا۔

اس دن کے بعد مینو سے دور دور رہنے لگا۔ وہ مجھے ایک پڑھی لکھی شائستہ طوائف دکھائی دیتی تھی مگر وہ تو جیسے میرے تعاقب میں رہتی تھی ادھر میں کلب میں داخل ہوا اور ادھر وہ سب کو چھوڑ کر میرے پاس آگئی۔ وہ بڑی اچھی اور دلچسپ باتیں کرتی تھی میں اس کے حسن اور اس کی ذہانت دونوں سے متاثر تھا۔ وہ سامنے آجاتی تھی تو بھاگ نہیں سکتا تھا مگر میری گفتگو زیادہ تر ہوں ہاں تک محدود رہتی تھی وہ بھی شاید میری بے اعتنائی پر حیران تھی۔ وہ کرید کرید کر سوال کرتی تھی مگر میں ٹال جاتا تھا ایک روز نہ جانے کیسے طوائف کا لفظ میری زبان پر آگیا۔ شاید وہ میرے ذہن پر اتنا حاوی ہوگیا تھا کہ میں اس کے سامنے بالکل بے بس تھا۔ ایک لفظ بعض اوقات آدمی سے بھی بڑا بن جاتا ہے۔ وہ آدمی کو پیچھے دھکیل کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

میرے منہ سے طوائف کا لفظ نکلتے ہی مینو اس طرح لرزی تھی جیسے اس کے اندر زلزلہ آگیا ہے۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کچھ سوچا تھا وہ شاید اپنے آپ کو سمیٹ اور سنبھال رہی تھی۔ پھر وہ مجھ پر جھپٹ رہی تھی۔ تم لوگ عورت کو طوائف کا نام دیتے ہو لیکن دنیا میں اصل طوائف تو مرد ہے۔ عورت اپنا جسم بیچتی ہے اور بے شک یہ بہت بری بات ہے۔ عورت کا جسم بڑا مقدس ہے۔ وہ ماں کا جسم ہے' بکاؤ مال نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی آواز دھیرے دھیرے معمول پر آرہی تھی اور مجھے اس خیال سے سکون ملا تھا کہ یہ لفظ شاید اس نے اپنے اوپر نہیں اوڑھا مگر مرد تو اپنا تن اور من اور علم اور دانش سب کچھ بیچ دیتے ہیں۔ اپنا ضمیر تک فروخت کر دیتے ہیں۔ رحم' انصاف اور انسانیت کا ہر جذبہ اور اصول نیلامی پر چڑھا دیتے ہیں۔ ظلم کرنا ان کا فرض بن جاتا ہے' قتل وغارت گری ان کی تنخواہ کا تقاضا ہوتی ہے۔ ذرا بتاؤ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے والے بدبخت مردوں کو طوائف کہنا بھی کیا اس لفظ کی توہین نہیں ہے اور ان مردوں کو کیا نام دوگے جنہوں نے لاکھوں بے گناہ اور بے خبر انسانوں پر ایٹم بم پھینکنے کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے بڑے فخر سے اعلان کیا تھا کہ ہم نے تاریخ بنائی ہے کون سی تاریخ ہے یہ وہ وحشیوں کی تلواروں اور توپوں سے لکھی گئی؟ کیا تباہی' بربریت اور سفلے پن کے جذبات ہی تاریخ ساز ہیں۔ انہوں نے کوئی تاریخ نہیں بنائی تھی۔ انہوں نے صرف اپنے ان آقاؤں کو خوش کیا تھا جن کی مدد کے بغیر وہ برسر اقتدار نہیں رہ سکتے۔ وہ ان پر حکومت بھی کرتے ہیں اور ان کے غلام بھی ہیں۔ انہوں نے دنیا پر امریکہ کی دھاک

بٹھانے کے لئے یہ ہولناک فیصلہ کیا تھا بیچارے جاپانی تو ایٹمی بھٹی میں بھننے جانے سے پہلے ہی ہار مان چکے تھے۔
کیا آج کوئی نئی کتاب پڑھ کر آئی ہو مجھے اس کا جوش میں آجانا اچھا لگا تھا۔ نہیں شاہد! تم نے بات ہی ایسی کی تھی سن سکتے ہو تو سنو! خدا کی اس دنیا میں مرد فساد کی ایک بڑی موٹی جڑ ہیں مرد ہی جنگیں چھیڑتے ہیں اور دیدہ دلیری دیکھو کہ وہ انسانوں کے خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھ چھپاتے نہیں' ان کی نمائش کرتے ہیں چند بدزیب تمغے اپنے سینے پر لگانے کے لئے تنخواہ میں چند ٹکوں کا اضافہ کرانے کے لئے! اپنے عزیزوں' دوستوں اور ساتھیوں پر اپنی جرات اور بہادری ثابت کرنے کے لیے! اگر کہیں ان کے پیارے بھی ایسی جرات مندی کی زد میں آجائیں تو یہی بہادر لوگ اپنے تمغوں سمیت بچوں کی طرح بلک بلک کے روئیں' اپنے گھر میں آگ لگے تو معلوم ہوتی ہے پانی کی قدر! بیچاری عورتیں تو مردوں کی لگائی ہوئی آگ میں خواہ مخواہ جل جاتی ہیں۔ کبھی بیٹی کے روپ میں کبھی ماں کی شکل میں اور کبھی بیوی بن کر اور ہاں کبھی طوائف بن کر میں تو کہتی ہوں۔ ساری دنیا کے مردوں کو اگر برقع پہنا کر گھروں میں بٹھا دیا جائے تو دنیا بڑی پرسکوں اور خوبصورت ہو جائے! ایسا پاگل خانہ نہ رہے۔
مردذات پر اس حملے کا میں جواب دینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں' اس نے میرے تیور بھانپ لئے اور براہ راست مجھ پر حملہ کر دیا۔
تم سے کیا کہوں شاہد! تم تو اخبار میں وہ کچھ بھی نہیں لکھتے جو تم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہو' صرف وہ کچھ لکھتے ہو جس کے تمہیں پیسے ملتے ہیں تم روز کلب میں آتے ہو اور وسکی یا بیئر کو ہاتھ نہیں لگاتے اس لئے کہ تمہارے کلب کا بل تمہارا دفتر ادا کرتا ہے اور تم ڈرتے ہو کہ بار کے خانے میں اگر کچھ پیسے درج ہو گئے تو سارے دفتر میں بدنام ہو جاؤ گے تم ذرا سی خوشی بھی اپنی بزدلی کی وجہ سے گنوا دیتے ہو' تم مرد لوگ بہت بزدل ہوتے ہو۔
یہ انتہا تھی' میرے لئے خاموش رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے میری دکھتی رگ کو چھیڑا تھا' میں نے جواب میں اس پر سخت وار کیا۔ میں اندر سے خوفزدہ تھا کہ اسے نہ جانے میرے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے۔ خوف کی حالت میں آدمی گھٹیا سے گھٹیا حربہ استعمال کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے میں نے مینو پر طنز کرتے ہوئے کہا' تمہیں شاید معلوم نہیں ہے تم سے پہلے بھی سیٹھ نجیب کی "گرل فرینڈ" تھیں' وہ انہیں دوسرے تیسرے مہینے بدل لیا کرتا ہے۔
معلوم ہے' معلوم ہے اس نے اپنا سر دو بار جھٹکا پھر میرے چہرے پر چیرتی ہوئی نظریں گاڑ دیں وہ گرل فرینڈ نہیں تھیں مجبور اور غریب رنڈیاں تھیں' وہ نجیب کے لئے لائسنس' ٹھیکے اور کارخانوں کے پرمٹ لاتی تھیں۔ نجیب جس آدمی کو رام کرنا چاہتا تھا۔ انہیں

اس کی جھولی میں ڈال دیتا تھا۔ جس طرح وہ اس کی میز پر نئی کار کی چابی اور رجسٹریشن بک چھوڑ آتا ہے۔ اس کے پینے پلانے کا بل ادا کر دیتا ہے۔ جوئے میں اس سے جان بوجھ کے موٹی سی رقم ہار جاتا ہے۔ وہ بیچاریاں تو قابل رحم تھیں۔ ان کا روپ تو رکابی میں تھا۔ وہ عیاش مردوں کی قیمت تھیں۔ میں مینو ہوں' مینو! کوئی مجھے ہاتھ لگا کے دیکھے اس کا منہ نوچ لوں گی میں کیا خود نجیب اس کی پسلیاں توڑ دے گا۔ اس کی گردن کی ہلکی گلابی جلد پر نیلی رگیں فخر سے تن گئی تھیں ان پر پڑی ہوئی نازک سی زنجیر لرزنے لگی تھی۔

وہ بات جہاں ختم کرنا چاہتی تھی' ختم کر دیتی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کی مرضی کے خلاف کسی موضوع پر گفتگو جاری رکھی جائے۔ اس نے بات بدلتے ہوئے کہا شاہد تمہارے کلب میں تو بڑے بوگس لوگ بھرے ہوئے ہیں۔ اس نے یہ جملہ بڑی نرمی سے ادا کیا تھا مگر مجھے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہی ہے تم بڑے بوگس آدمی ہو۔ میں نے دراصل اپنے دفاع میں کہا یہ لوگ کریم ہیں سوسائٹی کی۔

کھٹی کریم ہے' اسے تو بلی بھی سونگھ کر پلٹ جائے گی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر کہا مگر تمہیں ان لوگوں میں کیا بڑائی نظر آتی ہے؟

میں اس سوال پر ہڑبڑا سا گیا' رپورٹر ہونے کے ناطے مجھے سوال کرنا آتا تھا جواب دینا نہیں' پھر بھی میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ سردار ہیں جاگیردار ہیں' صنعت کار ہیں' سرمایہ دار ہیں' سیکرٹری اور جج ہیں' بریگیڈیئر اور جنرل ہیں' وزیر ہیں اور اسمبلیوں کے ممبر ہیں اور

بس۔ اس نے مجھے جملہ مکمل کرنے کا موقع نہ دیا شاہد! تم تو بچے ہی نکلے اور ایسا قہقہہ لگایا کہ گھبرا گیا۔ سیٹھ نجیب نے بھی اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں دو تین بار جھپک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی یہ نظریں بڑی خطرناک ہوتی تھیں۔ ان میں سے غنڈوں اور قاتلوں کی آنکھیں بھی جھانک رہی ہوتی تھیں اس نے اپنی آنکھیں مزید سکیڑ کر مجھے پہچانا اور پلٹ کر ایسی بے نیازی سے گلاس اٹھا لیا جیسے کوئی بات نہیں' ابھی بچھڑا ہے۔ پہلے تو مجھے اس کے اطمینان سے سکون ملا اور پھر غصہ آیا کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو دلال کہیں کا! مینو نے شاید میرے سارے خیالات پڑھ لئے اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور میں مزید شرمندہ ہو گیا۔ شاہد تم تو واقعی بچے ہو' اس نے میرے رستے ہوئے زخم کو کھرچا' میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ غصے اور ہتک کے احساس سے میرا بھیجا ابلنے لگا تھا۔ میرا دل اس طرح دھڑک رہا تھا' جیسے پتھر کوٹ رہا ہو۔ میں نے آستین چڑھا کر گھڑی دیکھی بہت دیر ہو گئی ہے۔ مجھے اب جانا چاہیے اور بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا مینو مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شفقت اور مسکراہٹ میں پیار تھا مگر وہ مجھے بری لگ رہی تھی۔ اس کا سارا حسن میرے سامنے پانی بن کے بہہ گیا تھا۔

اس روز میں بہت دنوں بعد ان لوگوں کے ساتھ کلب سے نکلا جو وقت پر آتے اور دن کی تھکن اتارنے کے بعد وقت پر اٹھ جاتے تھے۔ اپنے اکلوتے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں نے مینو اور اپنی باتوں پر غور کیا۔ غصے کی جھاگ بیٹھ گئی تو اپنی حماقتوں کی یاد پسینہ بن کے پھوٹنے لگی۔ بری حرکت یا بے ہودگی کے لئے شراب پینا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اکثر لوگ بن پیئے بے ہودگیاں کرتے ہیں۔ مجھے سیٹھ قاسم پر غصہ آیا تھا تو ٹھیک تھا' اس نے میری جوانی کی توہین کی تھی مگر مینو نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی تھی میرے سینے میں چبھ جاتی میری اخبار نویسی میں کتنی سچائی ہے جو اس کا پول کھلنے پر میں آگ بگولا ہو گیا۔ اس روز سیٹھ قاسم نے کتنی حقارت سے کہا تھا شاہد تمہاری رپورٹری کیا اور تمہارا اخبار کیا؟ میں تمہارا اخبار خرید کر بند کر سکتا ہوں۔ میں نے اس کے منہ پر طمانچہ کیوں نہیں مارا تھا؟ اسے گالی کیوں نہیں دی تھی؟ میں چپ چاپ کھڑا اس کے ٹیڑھے میڑھے قہقہے کیوں سنتا رہا تھا؟ میں نے مینو کو صاف صاف طوائف کہہ دیا تھا۔ اس سے بڑی اور کیا گالی ہو سکتی تھی؟ میرے قدم جوں جوں اٹھتے گئے میری ندامت اور پشیمانی بڑھتی گئی۔ میرا دل رہ رہ کے بیٹھتا رہا۔ مینو کی شفقت بھری آنکھیں میرے ساتھ چلتی گئیں اور بالآخر مجھ پر غالب آ گئیں۔

میں نے دفتر سے چھٹی لے لی اور کلب سے تین دن غائب رہا۔ نوکری تو کرنا ہی تھی اور دفتر والوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ کلب کی بنیادی رکنیت کی فیس ضائع کرتے اور میری جگہ کسی اور رپورٹر کو کلب کا ممبر بنواتے۔ آخر تنخواہ کی مجبوری نے مجھے گھسیٹ کر کلب میں دھکیل دیا' یا ہو سکتا ہے۔ میں کلب جانا ہی چاہتا تھا مینو کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے' شرمندگی کا احساس میرے قدم روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اتنا تو یقین تھا کہ مینو مجھ سے ناراض ہو گی اس لئے راستے میں ہی میں نے معذرت کے کچھ الٹے سیدھے جملے گھڑ لئے تھے مگر مینو تو جیسے میری راہ دیکھ رہی تھی' اس نے گہرے جامنی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ قمیض کے دامن اور آستینوں پر پیلے رنگ کی پٹیاں سلی ہوئی تھیں' اس کا دوپٹہ دورنگا تھا' یہ لباس اس پر خوب کھلا تھا۔ لباس کے معاملے میں اس کا انتخاب ویسے بھی لاجواب تھا۔ میچنگ اور کنٹراسٹ دونوں اس کی خوش ذوقی کی گواہی دیتے تھے۔ میں نے کسی دن میں بھی یہ نہیں دیکھا کہ روا روی میں کوئی کپڑا پہنا ہو یا کوئی لباس اس کے چہرے اور جسم سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس کی تنقید نے مجھے بھی ملبوسات کے معاملے میں قدرے محتاط بنا دیا تھا۔ وہ اکثر کہتی تھی لباس تو انسان زیبائش کے لئے اور اپنی شخصیت کے نکھار کے لئے پہنتا ہے ورنہ ایک لنگوٹی اور ایک چادر بھی بہت ہے۔ یہ انسان انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے کس طرح پیش کرنا چاہتا ہے۔ اپنے آپ کو تو اپنا پورا لباس صرف آئینے میں ہی دکھائی دیتا ہے وہ خود ایسی پوشاک پہنتی تھی جو اس کے پورے جسم کو ڈھانپ لیتی تھی' اس کا گریبان ہنسلی کی ہڈی کے ساتھ چپکا رہتا تھا اور ہمیشہ بند رہتا تھا۔ وہ ساڑھی باندھتی تھی تو اس کا بلاؤز پوری آستین کا ہوتا تھا اور ساڑھی کے اندر گم رہا

تھا کلب میں ہر طرف سانولی سفید زرد اور کالی کمریں لچکتی بانپتی پھرتی تھیں مگر مینو کی ننگی کمر کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ البتہ اس کے کانوں میں ناچتے ہوئے آویزے سب کی نظروں میں گھومتے رہتے تھے یا پھر وہ نازک سی سونے کی زنجیر تھی جو اس کی گردن کی حرکت کا ساتھ دیتی تھی۔ بس یہی وہ اس کے زیور تھے اور اس سے زیادہ کی اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں کلب کے دربان کے سلام کا جواب دے کر آگے بڑھا ہی تھا کہ مینو فلاش کی ایک چوکی چھوڑ کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے ایسی بے تکلفی سے گفتگو شروع کی جیسے پچھلی ملاقات بڑی ہی خوشگوار تھی یا وہ شام تو محض ایک خواب تھی۔ کیلنڈر میں کہیں درج نہیں تھی۔

عجیب لوگ ہیں مفت میں اچھے پتے بھی پھینک دیتے ہیں۔

کون؟ میں نے اپنی ندامت پر روکھا سوکھا پردہ ڈالا۔

وہ جو سامنے چوکڑی بیٹھی ہے تم تو بہت اچھے رپورٹر ہو بتاؤ وزیر زیادہ جیتے گا یا سیکرٹری؟ میرا تو خیال ہے سیکرٹری بھاری پرس لے کر جائے گا وزیر کیا ہے آج ہے کل نہیں ہے جاگیرداروں اور سیٹھوں کو کسی بندے سے نہیں حکومت سے کام پڑتا ہے۔

شرمندگی کا احساس ابھی تک میرے ذہن میں خوفزدہ مینڈک کی طرح پھدک رہا تھا میں تھوڑی دیر کے لئے مینو کو ٹالنا چاہتا تھا۔

مجھے شاہ صاحب کی تلاش ہے ان سے مل کے آتا ہوں۔

بیٹھو۔ وہ کرسی کھینچ کر میز کے سامنے ڈٹ گئی کیا میں تمہیں نہیں جانتی شاہد تمہیں تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔ اس کی مسکراہٹ تو لوہے کو بھی پگھلا سکتی تھی میں چپکے سے بیٹھ گیا۔

اس شام تمام کچھ ناراض ہو گئے اسی لئے تین دن کلب نہیں آئے دیکھو چھوٹی چھوٹی باتوں کا اچار ڈال کے نہیں بیٹھ جاتے خیر بات تو کوئی نہیں تھی پھر بھی معاف کر دو۔

معافی تو مجھے مانگنی چاہیے تھی مگر ایک خاتون کو معافی کا خواستگار دیکھ کر میرے اندر مرد کا غرور ٹھاٹھیں مارنے لگا میں نے اپنی آواز میں مصنوعی بھاری پن پیدا کرتے ہوئے کہا دیکھو مینو۔

مینو نہیں مریم! اس کی آواز اور لہجے میں ذرا سی بھی مرعوبیت نہیں تھی میرا نام مریم ہے دیکھو برا مت ماننا تم مجھے اپنے چھوٹے بھائی لگتے ہو تمہیں دیکھ کر میرے دل میں نہ جانے کیوں ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ میرا کوئی بھائی نہیں ہے میں کسی کی ماں نہیں ہوں پھر بھی مجھے معلوم ہے میں بہت اچھی ماں ہوں گی۔ بے حد پیار کرنے والی سب کو معاف کر دینے والی وہ لمحہ بھر رک کر میز پوش کی شکن سہلاتی رہی شاہد جب تم سے کوئی معافی مانگے نا تو اسے فوراً معاف کر دیا کرو راہ میں سوچ کے روڑے مت پھیلایا کرو معافی مانگنے کے لئے

بڑا دل گردہ چاہیے' معاف کر دینا تو کوئی بات نہیں ہے ذرا سی زبان ہلتی ہے اور وہ بن بولے بھی ہلتی رہتی ہے۔

مینو کے منہ سے یہ باتیں بڑی عجیب لگ رہی تھیں میرا ذہن ابھی انہیں سمجھنے اور جذب کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میری زبان بول پڑی تمہارا نام مریم ہے تو مینو کیوں کہلواتی ہو؟

مریم تو بڑا پیارا اور سچا نام ہے میرے ماں باپ نے مل کر رکھا تھا' مریم کو کوئی رکھیل کہے تو میں اس کی زبان کھینچ لوں۔

کیا نام بدلنے سے انسان بدل جاتا ہے۔ اس سوال نے مجھے احساس دلایا کہ میرا ذہن اور زبان ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

نام بدلے بغیر بھی انسان بدلتا رہتا ہے۔ ہوتا کچھ ہے' دکھتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے' چھیلنے بیٹھو تو کوئی اندر سے موم نکلتا ہے تو کوئی لوہا اور پیاز کے چھلکوں سے بنا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ عمر بھر کینچلیاں اتارتے اور ان سے دور بھاگتے رہتے ہیں اور کچھ گرگٹ کی طرح خوف سے اپنا اصلی رنگ چھپائے رکھتے ہیں۔ اس نے میری نظروں کا تعاقب کیا اور مسکرائی۔ وہ عورت تمہیں شاید خوبصورت لگ رہی ہے۔ بار بار تمہاری نگاہ اس کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ اس کا میک اپ دھو دو تو وہ دور سے بھی چڑیل لگے گی' ویسے دل کی بڑی اچھی ہے۔ ہر ایک کی مدد کرنے کو تیار رہتی ہے۔ اس نے اپنا جادو صرف اپنے شوہر کے لئے رکھ چھوڑا ہے' وہ سر شام اسے مکھی بنا کر مٹھی میں بند کر لیتی ہے صبح جب یہ مکھی جون بدلتی ہے تو شیر کی طرح دھاڑتی ہے' لوگ اس کے سامنے تھر تھر کانپتے ہیں۔ اسے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ وہ اس طرح بولے چلی جا رہی تھی جیسے کسی نے مشین گن پر پٹہ چڑھا کر اس کی لبلبی دبا رکھی ہو۔ تم نے کلب پچھلے لان کے کنارے پر وہ فلیم آف جنگل کا درخت دیکھا ہے۔ جسے پچھلے دنوں آندھی نے الٹ دیا تھا۔ اس کی بیشتر جڑیں ڈوبتے ہوئے آدمی کے پنجے کی طرح آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں اور باقی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی ہیں۔ درخت کے اوپر چوڑے چوڑے سبز پتے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی کوئی سرخ پھول بھی جھانک رہا ہے۔ پتوں نے درخت کے سوکھے ہوئے آدھے دھڑ کو ڈھانپ رکھا ہے مگر اسے آہستہ آہستہ زمین کی بیٹی چاٹ رہی ہے۔ یہ سب لوگ جنہیں تم سوسائٹی کی کریم کہتے ہو۔ اس درخت کی طرح ہیں۔ اوپر سے ہرے بھرے دھوکہ دیتے ہوئے اندر سے سوکھتے ہوئے اور نیچے سے زمین کی بیٹی کی خوراک!

زمین کی بیٹی میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہاں! سارے جاندار زمین کی اولاد ہیں۔ لیکن وہ سب زمین سے اوپر اٹھنے اور اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں' بالآخر زمین انہیں کھینچ کر اپنی مٹی میں مٹی کر دیتی ہے۔ مگر دیمک ہر جگہ مٹی کو ساتھ لے کر چلتی ہے وہ اپنے آپ کو ہر وقت زمین سے جوڑے رکھتی ہے۔ وہ اپنی مٹی کی بارک کی چھت پر بھی نہیں چڑھتی' اس لئے کہ اسے زمین سے پیار ہے' وہ ہر جگہ اپنے آپ کو زمین کی گود میں

پاتی ہے میں اسے زمین کی بیٹی کہتی ہوں اور زمین کی فوج بھی جو سب کچھ چاٹ جاتی ہے۔

وہ میری حیرت سے محظوظ ہو رہی تھی اس نے جیسے مجھے جھنجھوڑا۔ میں پھر پوچھتی ہوں شاید تم کلب میں کیا لینے آتے ہو تم آدمی بھی نہیں پہچانتے؟

کس آدمی کی بات ہو رہی ہے؟ درمیانے قد کا ایک ادھیڑ عمر شخص ہماری میز کے پاس آ کر رکا اس کی رنگت سانولی تھی سامنے کے دانت اٹھے ہوتے تھے اور آنکھوں میں عیاری کی موجیں چل رہی تھیں۔

آپ کے سوا کس کی بات ہو سکتی ہے رحیم بھائی! میں شاہد سے کہہ رہی تھی تم رحیم بھائی جیسے آدمی کو نہیں پہچانتے تو کلب میں کیا لینے آتے ہو۔ ان جیسا شریف اور اچھا انسان ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔

اچھا تو ہم بھی ایسے خوش نصیب ہیں کہ مینو رانی ہماری غیر حاضری میں بھی ہمارا ذکر اتنے اچھے لفظوں میں کرتی ہے۔ رحیم کے سیاہی مائل ہونٹوں میں سرخ سرخ مسوڑھے جھانکنے لگے میری طرف دیکھ کر پوچھا ان کی تعریف؟ یہ شاہد ہیں اخبار میں رپورٹر ہیں۔ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے اس طرح غور سے دیکھا جیسے اخبار پڑھ رہا ہے پھر جیب سے سونے کا سگریٹ کیس نکالا جس پر جڑا ہوا پتھر ہیرے کی طرح لشکارے مار رہا تھا شاید ہیرا ہی ہوگا۔ سگریٹ نکالا اور اسے ہیرے کے اوپر ٹھکورا اس سے پہلے کہ سگریٹ اس کے منہ تک پہنچتا اس کے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی کا ہاتھ بڑھا لائٹر میں شعلہ نکلا۔ رحیم نے سر کو ذرا سا خم دے کر سگریٹ سلگایا اور یوں کش لیا جیسے سگریٹ بھی ہیرے کا ہے۔ اس نے مینو پر سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پھر ملیں گے۔ کہہ کر آگے بڑھ گیا سگریٹ لائٹر والے آدمی کا ہیولا اس کے قدم گنتا ہوا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

''یہ کون صاحب ہیں؟'' میں نے رحیم کو پہلی بار کلب میں دیکھا تھا۔

یہ شخص اسمگلروں کا بادشاہ کہلاتا ہے اس سے دور ہی رہنا آدمی کو چٹکی بجانے میں اس طرح خرید لیتا ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ ایک دن ترنگ میں تھا مجھے مرعوب کرنے کے لئے کار کی ڈکی کھول کے دکھائی نوٹوں سے بھری ہوئی تھی پتہ نہیں کتنے لاکھ ہوں گے کہتا تھا کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے چار پیسے ہر وقت پاس رہنا چاہئیں۔ میں نے مذاق میں کہہ دیا رحیم بھائی آپ کی کار چوری کرنے والے کی تو قسمت کھل جائے گی۔ اس نے چونک کر چاروں طرف ایسے دیکھا تھا جیسے پودے پودے میں چور چھپے ہوئے ہیں اور اس کی ڈکی پر حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں وہ دن اور آج کا دن وہ تین کاروں میں آتا ہے۔

تین کاروں میں؟

ہاں! سمگلر بڑے محتاط لوگ ہوتے ہیں' اس کی دو کاروں میں تین تین مسلح محافظ ہوتے ہیں امریکہ کی طرح رحیم بھائی کو بھی جنگ بڑی راس آتی ہے' اس پر بھی دنیا کے سارے راستے کھل گئے ہیں۔ ادھر کا مال ادھر کرتا ہے اور کروڑوں بنا لیتا ہے کہتے ہیں اس نے فسادات میں بھی بڑی لوٹ مچائی تھی مگر میں نہیں مانتی یہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالتا' شکر ہے اس کی دنیا وسیع ہے۔ جاپان اور یورپ تک مار کرتا ہے' اگر کہیں ملک میں ہی رہتا تو نجیب کا بڑا سخت حریف ہوتا' ذرا آنکھ بچا کے دیکھو' تمہارے کلب کی کریم کس طرح بہہ بہہ کر اس کے پاس پہنچتی ہے۔

واقعی! میں نے دل میں کہا بھنبھناتی مکھیاں رحیم کی میز پر گر رہی ہیں۔ کوئی شخص تھرکتا ہوا اس کے پاس پہنچا' کوئی لچکتا ہوا' کوئی باچھیں پھاڑے' کوئی ہاتھ بڑھائے کوئی نظریں جھکائے' میں ان کی مضحکہ خیز حرکتوں سے محظوظ ہو رہا تھا کہ مینو نے آہستہ سے کہا پیسے کی پھسلن بڑی سخت ہے شاہد قدم جمنے ہی نہیں دیتی' بڑے بڑوں کے پیر پھسل جاتے ہیں اور اپنے ہاں تو اب ایسا لگتا ہے کہ بس پھسلن ہی پھسلن ہے تم ذرا سنبھل کے رہنا۔ اس نے بار کی طرف دیکھا۔ اوہ بیچارہ نجیب اکیلا رہ گیا ہے اور وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس چلی گئی۔

جوں جوں دن گزرتے گئے میں مینو کا گرویدہ ہوتا گیا اب میں نہ اس کی کسی بات کا برا مانتا اور نہ اس سے کترانے کی کوشش ہی کرتا۔ وہ ہر شام کلب کا ایک راؤنڈ اس طرح لیتی تھی جیسے وہ میزبان ہے اور دیکھ رہی ہے کہ ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے اور سب مہمان اپنی اپنی جگہ خوش ہیں' میری طرح بیروں سمیت بھی لوگ اس راؤنڈ کا انتظار کرتے' فرق یہ تھا کہ میں راؤنڈ ختم ہونے کا منتظر رہتا اور وہ راؤنڈ شروع ہونے کا بیرے مجھ سے زیادہ بے تاب دکھائی دیتے تھے کیونکہ مینو اپنے مرغوب مشروب ''نمبو پانی'' کے لئے بھی دستخط کرتی تو آبدار کے ہاتھ میں دس کا نوٹ تھما دیتی تھی کار سے اترتے ہوئے چوکیدار کو اور کلب میں داخل ہوتے وقت دربان کو دس دس روپے انعام کے طور پر دیتی۔ وہ شام بھر میں نمبو پانی کے کتنے گلاس چوس سکتی تھی یا مختلف میزوں پر چپس' فنگر فش یا سیخ کباب کی کتنی پلیٹیں بھیج سکتی تھی بہت سے بیرے تو اس تک پہنچ ہی نہیں سکتے تھے وہ اپنے راؤنڈ میں سب کو دس دس روپے پکڑا آتی تھی۔ ان دنوں دس روپے بہت ہوتے تھے۔ کل ملا کر بیرے کی تنخواہ سو روپے بھی مشکل سے بنتی تھی۔ کسی دن جب وہ بہت خوش ہوتی تو اتنی زیادہ رقم ٹپ کے طور پر دے دیتی کہ آبدار کلب کے مدہوش ممبروں کی وسکی چرانا بھول جاتے تھے ٹپ تو ہر ممبر دیتا تھا کہ یہ بھی کلب کی ایک ریت تھی۔ مگر بڑے بڑے سیٹھ بھی روپے کا نوٹ اس طرح مسل مسل کر جانچتے تھے جیسے سنار کسوٹی پر سونا کستا ہے اور جب انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ ایک ہی نوٹ ہے تو اسے بیرے کی طرف اس طرح بڑھاتے تھے جیسے اچار کھا رہے ہوں' ایک مینو

تھی جو اپنے ہینڈ بیگ کا ایک خانہ دس دس روپے کے نوٹوں سے بھر کر لاتی تھی اور اسے خالی کر کے واپس جاتی تھی آخری تیس چالیس روپے بار مینوں کی قسمت کے ہوتے تھے۔ وہ نجیب کو اٹھاتے ہوئے انہیں تقسیم کر دیتی تھی یہی وجہ تھی کہ بیروں کی نظریں مینو پر اس طرح لگی رہتی تھیں جس طرح شہد کے چھتے پر مکھیاں لگی رہتی ہیں۔ بیروں کی نگاہوں کا پیچھا کرتے ہوئے ممبر بھی مینو کی طرف متوجہ رہتے۔ وہ بہت سی گرم گرم نظروں کے شاور تلے مسکرا مسکرا کر نہاتی اور اسے دیکھ کر سیٹھ نجیب کا قد اور لمبا ہو جاتا۔

کئی بار میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ مینو مجھے بیروں کی طرح استعمال کر رہی ہے میں محض ایک کھلونا ہوں' جس سے وہ بھرے کلب کی تنہائی میں دل بہلاتی ہے میرا شک اگر ٹھیک بھی ہوتا تو میں بھی ان ممبروں کی طرح بے بس تھا' جن کی توجہ کی نہر میں پانی تین ماہ سے ایک ہی سطح پر بہہ رہا تھا' مجھے تو اسے مسکراتے دیکھ کر عجیب سا سکون ملتا تھا' اس کی باتیں سن کر سرور حاصل ہوتا تھا۔ میں اس کی کھنکتی گاتی آواز میں سے لذت کشید کرتا تھا۔ میں پوری طرح اس کے جال کے پھندوں میں الجھ گیا تھا اور میں انہیں توڑنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر میرا شبہ غلط تھا مینو نے اپنی زندگی کی کتاب کے کئی ورق میرے سامنے کھول دیئے تھے۔ وہ مجھ پر بھروسہ کرنے لگی تھی۔

یہ بات مجھے اسکی زبان سے ہی معلوم ہوئی کہ اس کے ماں باپ بے حد شفیق اور مہربان تھے اور اس سے بڑا پیار کرتے تھے۔ ان میں اگر کسی وقت تکرار بھی ہو رہی ہوتی تو مینو کو دیکھتے ہی اسے بھول جاتے اور اس کی طرف یوں لپکتے جیسے اسے دو ٹکڑوں میں بانٹ لیں گے۔ وہ آج تک حیران تھی کہ وہ دونوں اس طرح اچانک اسے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے کوئی ایک تو اسے اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ پھر بھی وہ بار بار کہتی تھی ''میری دعا ہے کہ میں جیسی ہوں ویسی ہی آسمانوں میں دوبارہ پیدا ہوں بس ایک آرزو ہے کہ میرے ایک کاندھے سے میری ماں کا ہاتھ ہو اور دوسرے پر میرے باپ کا!'' اس کے گلے میں سونے کی جو نازک سی زنجیر کپکپاتی رہتی تھی وہ اس کی ماں کا آخری تحفہ تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے اس نے مینو کی گردن سے ملی جلی دھات کی زنجیر اتار کر اپنے پرس میں رکھ لی تھی اور اپنے گلے سے سونے کی چمکتی ہوئی زنجیر اتار کر اسے پہنا دی تھی' اس وقت زنجیر میں لگی ہوئی صلیب اس کی ناف تک پہنچتی تھی۔ باپ نے جاتے ہوئے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا تھا' اسے خوب بھینچا تھا اور اس کے ماتھے پر بے تحاشا پیار کئے تھے۔ وہ ہمیشہ اس کے ماتھے پر ہی پیار کیا کرتا تھا جس پر اب ایک موٹی سی بندی پہرا دیتی رہتی تھی۔ وہ اس پیار کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ جونہی باپ کے قریب جاتی' اپنا ماتھا اٹھا کر اس کے سامنے کر دیتی' وہ ابھی تک اپنے ماتھے پر باپ کے ہونٹوں کی نمی محسوس کر سکتی تھی جو دھیرے دھیرے اس کے دماغ میں اتر کر اسے گرم رکھتی تھی۔

اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے اس نے ایسی باتیں کئی بار دہرائیں کہ ہم لوگ بڑے ہو کر بھول جاتے ہیں کہ پیار تو پنگھوڑے سے شروع ہوتا ہے اور مکمل پیار تو وہ ہوتا ہے جو چھ سات روز کا بچہ اپنی ماں کے سینے سے لگ کر ظاہر کرتا ہے وہ دودھ کا بھوکا نہیں ہوتا وہ تو ماں کے جسم کی گرمی محسوس کرتے ہی سو جاتا ہے۔ پیار تو انسان کی فطرت ہے پیار اس کا سچا جذبہ ہے نفرت تو اسے سکھائی جاتی ہے۔ نفرت تو وہ دنیا سے حاصل کرتا ہے۔ خوف اور محبت سے محرومی کے باعث ظلم کرنے یا ظلم کا مقابلہ کرنے کے ذریعے اور تحقیر کا جواب دینے اور لوٹ مار سے بچنے کی کوشش میں! نفرت انسان اپنے ماحول سے کشید کرتا ہے' شراب کے چشمے نہیں ابلتے وہ کشید کی جاتی ہے۔ اچھی ڈسٹلری سے ملائم سی تلخی لے کر نکلتی ہے اور بری ڈسٹلری سے کڑی کیلی زہریلی۔

نفرت کا جو ناچ ہم نے چند سال پہلے دیکھا تھا اس سے تو لگتا ہے کہ دنیا نفرت پر قائم ہے۔ انسانوں کے درمیان نفرت کا رشتہ سب سے مضبوط ہے نسلوں کے پڑوسی ایک دوسرے کا گھر لوٹنے کی سازشیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھاتے تھے' نفرت سے مغلوب ہو کر انسان ایسی حرکتوں پر اتر آئے تھے جو درندے بھی نہیں کرتے۔

ہاں! ان دنوں کی یاد سے بھی میری روح لرز اٹھتی ہے اس کے چہرے پر ملال کی چھاؤں پھیل گئی تھی پھر سوچتی ہوں دریا میں سیلاب روز تو نہیں آتے۔ سیلاب دریا تو نہیں ہوتے' دریا تو وہ ہوتا ہے جو اپنے کناروں کے اندر بہتا ہے' جو آسمانوں کے لئے آئینہ ہوتا ہے سیلاب تو دریا بھی گدلا کر دیتے ہیں وہ تو بے رحم ہوتے ہیں۔ تند اور تباہ کن ایسوع مسیح نے جن کا پاک نام فرشتوں نے رکھا تھا بشارت دی ہے کہ مبارک ہیں وہ جو رحم دل ہیں کہ ان پر ہی رحم کیا جائے گا۔ یہ جملے اس نے اتنے احترام سے ادا کئے تھے۔ جیسے وہ ایک نن ہے اور پھر نفرت سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ مہاتما بدھ نے کتنی اچھی بات کہی ہے نفرت سے آج تک کوئی شخص نفرت کو فتح نہیں کر سکا میں نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو بہت نفرت کرتے ہیں وہ دوسروں کو تو آزار پہنچاتے ہیں مگر خود بھی جلتے ہی رہتے ہیں۔ اس دن بریگیڈیئر صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اگر دشمن سے نفرت نہ کی جائے تو اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ صرف نفرت ہی انسان کو کسی کی جان لے لینے کے جرم پر آمادہ کر سکتی ہے۔

وہ ابھی تک سوچ رہی تھی کہ اس سے رخصت ہوتے وقت اس کی ماں اور باپ کی آنکھوں سے جو آنسو بہہ رہے تھے وہ ضرور سچے تھے مگر وہ اس کے پاس انہیں کھینچ کیوں نہیں لاتے تھے۔ اس کا چچا شاید ٹھیک ہی کہتا تھا کہ ان میں طلاق ہو گئی تھی وہ دونوں ملک چھوڑ کر ولایت چلے گئے تھے پھر جنگ چھڑ گئی تھی اور ان کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ شاید وہ بھی جرچل کے خون پسینے کے تحفے میں شامل کر دیئے گئے تھے۔

مینو کی اس بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بار بار جنگ اور تباہی کا ذکر کیوں کرتی ہے؟ اسے اپنے ماں باپ لندن میں ملبے کے ڈھیر کے نیچے دم توڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہیروشیما میں ایٹمی آگ میں جلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور برلن میں فاتح سپاہیوں کے سامنے بھیک کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں! وہ جیتی اور ہاری ہوئی دونوں اقوام کے لیڈروں سے یکساں نفرت کیوں کرتی تھی اور دونوں کے عام آدمیوں کو قابل رحم کیوں سمجھتی تھی؟

وہ اپنے چچا کو بھی سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس کے ماں باپ نے رخصت ہونے سے پہلے اس کی پرورش کے لئے خاصی بڑی رقم چچا کے حساب میں جمع کرا دی تھی اور اس کے ہاتھ میں بائبل دے کر وعدہ لیا تھا کہ وہ اسے اپنے بچوں کی طرح پالے گا اور پڑھائے لکھائے گا۔ اس کے چچا کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ کسی بچے کے جذبات کو سمجھنے اور اس سے پیار کرنے کا طریقہ جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی بے ضرر شرارتوں سے لطف لینے کی بجائے بگڑ اٹھتا تھا۔ اسے پیسے پیسے کے لئے ترساتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی اس کے دل کی طرح تنگ ہوتا گیا تھا وہ اس سے ذرا سا بھی پیار نہیں کرتا تھا۔ اس لئے وہ بھی اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کرتی تھی۔ ایک روز وہ سکول سے آئی تو چچا نے اسے پکڑ کر اس کا ماتھا چومنا چاہا۔ مینو نے پہلے سر جھکا کر پھر اسکی بغل میں سر دے کر اپنا ماتھا بچایا میرے ماتھے پر میرا باپ پیار کرتا تھا میں اس پر کسی دوسرے کے ہونٹ کیسے برداشت کر سکتی تھی مگر چچا کو بھی جیسے ضد ہو گئی تھی۔ اس نے میرے بالوں کی پونی ٹیل پکڑ کر میرا ماتھا آسمان کی طرف اٹھایا' اس وقت وہ مجھے ایک دیو لگ رہا تھا جس کے موٹے موٹے ہونٹ میرے ماتھے کا لقمہ بنانے کے لئے بڑھ رہے ہیں' میں تڑپ اٹھی اور اپنے ناخن چچا کے گالوں میں گاڑ دیئے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس روز کے بعد میرا کوئی چچا نہیں تھا' اس نے عجیب سے افسردہ انداز میں بتایا بعد میں اس کی چچی نے اسے ہوسٹل میں داخل کرا دیا تھا۔ وہ چچا کی جھوٹی قسموں کا پراشچت کرنے کے لئے چوری چھپے اس کی فیس بھی ادا کر دیتی تھی اور جیب خرچ کے نام پر کچھ پیسے دے بھی جاتی تھی۔ وہ زمانہ اس نے بڑی مشکل سے کاٹا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے ترستی رہتی تھی۔ اس نے پڑھائی پر اتنا زور دیا تھا کہ وظیفہ مل گیا تھا۔ اس سے وہ اپنی تھوڑی بہت ضرورتیں پوری کر لیتی تھی۔ مینو کی زندگی کے یہ واقعات کسی کو بھی معلوم نہیں تھے۔ وہ مجھے بار بار یاد دلاتی تھی کہ یہ باتیں میں صرف تمہیں بتا رہی ہوں اور کسی کے سامنے دہراؤں تو بہت دکھ ہو گا شاید اسی لئے وہ اپنی زندگی کی داستان کاٹ کاٹ کر بیان کرتی تھی۔ وہ بھی غالباً مجھے خوش کرنے کے لئے یا ہو سکتا ہے کہ یہ میری محض خوش فہمی ہو وہ اپنی زندگی کی پوری کتاب سنانا ہی چاہتی ہو اور اسے اب تک مجھ ایسا سننے والا نہ ملا ہو۔ اس روز میں بڑے شوق سے اس کی ہوسٹل کی زندگی اور تعلیم کے بارے میں باتیں سن رہا تھا کہ اچانک اس نے پردہ تان دیا۔

وہ سفید مونچھوں والے صاحب ہیں نا! انہیں دیکھو بڑے بارعب اور خوبصورت ہیں۔ ایسا جوان بڑھاپا تو انسان اپنی جوانی دے کر بھی خرید سکتا ہے' شیکسپیئر نے زندگی کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے' مگر یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو زندگی کے پانچویں حصے سے چھٹ کر رہ گئے ہیں۔ ان کے پاس مت جانا تمہیں شرمندہ کر دیں گے۔ اس نے شہ دینے کے انداز میں کہا۔

کیوں؟ ان میں سیہہ کی طرح کانٹے ہوتے ہیں۔

ہمت ہے تو جا کے دیکھو اکیلے کھڑے ہیں۔ اس نے مزید اکسایا۔

میں نے بلا سوچے سمجھے اس کا چیلنج قبول کر لیا اور اجنبی بزرگ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا ہیلو ینگ مین! مینو سے بہت باتیں کر لیں' اس سے اکتا گئے ہو گے۔ کوئی بات نہیں' انسانی فطرت ہے' تبدیلی چاہتی ہے۔

میرا رنگ شاید سرخ پڑتا دیکھ کر اس نے کہا مینو بھی میری بیٹی کی طرح ہے وہ میری بھتیجی کھڑی ہے۔ اس سے ملو' دیکھو کتنی خوبصورت ہے' کسی دن گھر بھی آؤ نا۔ میں جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اس کی سفید مونچھیں اکھیڑ لوں' مگر وہ تو بڑے پیار سے مسکرا رہا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے اور بھی اچھا لگ رہا تھا' مسکراتے چہرے پر کس کا ہاتھ اٹھ سکتا ہے۔ میں نے پلٹ کر مینو کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شرارت کے شرارے چمک رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ بزرگ اپنی بھتیجی کو بلا کر میرا تعارف کراتا' میں واپس آ کر مینو کے پاس بیٹھ گیا۔ عجیب واہیات آدمی ہے۔ میں نے اپنے چہرے سے شرمندگی پونچھنے کی کوشش کی تو مینو مسکرانے لگی۔

ارے بھائی کبھی کبھار ایسی باتوں سے بھی لطف اٹھا لیا کرو' مجھے معلوم ہے تم اندر سے اتنے خشک نہیں ہو' بنتے زیادہ ہو مینو نے میری شرمندگی کا احساس مٹاتے ہوئے مجھے اور شرمندہ کر دیا۔ وہ شاید میری حالت بھانپ گئی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ میں پھر بگڑ جاؤں اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا سنو یہ بہت تنہا آدمی ہیں' اندر سے ٹوٹے پھوٹے اور کٹے پھٹے ان کے اکثر دوست مر گئے ہیں اور جو باقی بچے ہیں وہ ملک سے چلے گئے ہیں یا بالکل ہی گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ جب افسری کے ٹھاٹ تھے تو انہوں نے ایک بڑا حلقہ بنایا تھا' وہ ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی بکھر گیا۔ جن لوگوں پر انہوں نے بڑے بڑے احسان کئے تھے وہ اب ان سے کترا کے نکل جاتے ہیں کہ کہیں سلام نہ کرنا پڑے۔ تین سال پہلے ان کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تو بالکل اجڑ گئے شاید! تم اگر غور کرو نا تو افلاس کی طرح تنہائی بھی بڑی ظالم چیز ہے' کمر توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ تنہا آدمی اپنے آپ کو بڑا غیر محفوظ اور قابل رحم سمجھنے لگتا ہے۔ وہ خود غرض ہو جاتا ہے۔ ایک دن وسکی چڑھ گئی تھی تو بیٹھ کے رونے لگے۔ دنیا میں اب ایک بھتیجی کے سوا ان کا کوئی نہیں ہے۔

ان کی بھتیجی ایک شادی کر کے چھوڑ چکی ہے اس وقت اتنے تنہا نہیں تھے مگر اب نہیں چاہتے کہ ان کی بھتیجی شادی کرے پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہے؟ میرے خیال میں لوگ موت سے نہیں ڈرتے' زندگی سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اگر توقع سے زیادہ لمبی ہو گئی اور ان کے جسم میں بیماریوں نے گھر بنا لیا تو وہ کیا کریں گے؟ اگر بے کار ہے تو ناکارہ ہو جائیں گے اور ان کا کوئی ساتھی نہ ہوا تو وقت کیسے گزاریں گے؟ بھری دنیا میں یہ خوف عجیب سا ہے۔ اس لئے کہ یہاں ناکارہ عورتیں اور ناکارہ مردوں کی افراط ہے دونوں مل کر۔۔۔۔

ناکارہ مردوں کا اضافہ تو تم نے اپنی طرف سے کیا ہے۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ اصل لائن میرا مطلب ہے انگریزی ترجمہ یوں ہے کہ

Very plentiful are worthless women

اس نے میری طرف یوں چونک کے دیکھا جیسے کوئی بچہ بڑی سی بات کہہ دے اور سننے والے کو یقین نہ آتے کہ یہ بات بچے کی زبان سے نکلی ہے شاید اس نے میرا نام طویل کر دیا تم ادب بھی پڑھتے ہو' یونانی کلاسکس بھی واہ میں تو تمہیں نرا اخبار نویس سمجھتی تھی' کبھی کوئی شعر ہی پڑھ دیتے تو مجھے اندازہ ہو جاتا یہاں تو اکثر لوگ اندر باہر سے چٹیل سینے لئے پھرتے ہیں۔ ان کے دماغ بھی ان کے پیٹ کی طرح پھول گئے ہیں۔ وہ اس طرح خوش ہو رہی تھی' جیسے اسی نے مجھے یونانی کلاسکس پڑھائے ہیں میں اس کی داد سے پریشان ہو رہا تھا اب تو اسے گفتگو کے لئے ایک اور وسیع موضوع مل گیا تھا۔

تم یہ تو بتاؤ یونانی ڈراموں میں تمہیں کس عورت کا کردار پسند ہے؟ وہ جیسے میرا امتحان لے رہی تھی۔

پولی زینہ۔ پتہ نہیں یہ نام میرے ذہن میں کہاں چھپا ہوا تھا۔ یہ کوئی اہم کردار نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔

تم مرد لوگ بھی خوب ہو' تم لوگوں کو ایسی عورتوں کے کردار ہی پسند آتے ہیں جو خوبصورت' معصوم اور راضی برضا ہوں بیچاری پولی زینہ' خود چل کر اکیلیز کی قبر کا تعویذ بن گئی' شکست تو ہو چکی تھی مگر پولی زینہ اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنے سے انکار کر سکتی تھی۔ وہ اکیلیز کے بیٹے کے خنجر کے سامنے سینہ کھولنے کی بجائے خودکشی کر سکتی تھی تم تو اگامنون کی بیٹی افگلینہ کو بھی پسند کرتے ہو گے جو اپنے باپ کے لشکر پر دیوی کو مہربان کرنے کے لئے خاموشی سے ذبح ہونے کو چل پڑی تھی۔

خاموشی سے نہیں اس نے اپنی جاں بخشی کے لئے اپنے باپ سے التجا کی تھی۔ اس نے شاید کہا تھا مجھے وقت سے پہلے تاریک دنیا میں نہ بھیجو' میں تمہارا پہلا بچہ ہوں' میں نے ہی دنیا میں پہلی بار تمہیں ابا کہہ کر پکارا تھا اور اس نے!

التجا کی تھی احتجاج نہیں کیا تھا اپنی زندگی کا چڑھاوا چڑھانے سے انکار نہیں کیا تھا مینو نے میری دلیل کی تصحیح کی۔ وہ تو دیوی کو رحم آ گیا اور اس نے افگلینہ کی جگہ ذبیحہ بھیج کر اس کی جان بچالی' وہ بچاری تو قربانی دے چکی تھی۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں یقیناً اوفلیا کا کردار اچھا لگتا ہوگا۔ بے چاری معصوم عشق میں دیوانی ہوگئی اور ان جانے میں ڈوب مری' عورت کے معاملے میں تم مرد لوگ ذرا بھی بڑے نہیں ہوئے۔ ذرا سا بھی گرو نہیں کیا' تم لوگوں نے۔

''سب مان لیا' مگر تم اپنے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔''

چھوڑو اسے! اس نے پیار سے منہ بنایا۔ تم نے اتنے دنوں اپنا مطالعہ چھپائے رکھا اور مجھ سے معلوم کرتے ہو میری گمشدہ زندگی کے سراغ! میں بعض اوقات سوچتی تھی کہ تم کبھی کبھار کوئی خوبصورت بات کیسے کر جاتے ہو' پتہ نہیں مجھے کیوں ایسا لگتا تھا جیسے جذبی صاحب ریڈیو کے مشاعرے میں ترنم سے اپنے خوبصورت شعر پڑھ رہے ہیں۔ ترنم اور شعر میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ تم سے کبھی لٹریچر پر بات ہی نہیں ہوئی۔

میں تو تمہاری یادیں سننا چاہتا ہوں' مجھے اچھی لگتی ہیں میں نے اصرار کیا۔ پھر کبھی رات زیادہ ہوگئی ہے نجیب کو نہ اٹھایا تو وہ صبح تک پیتا ہی رہے گا اور اگر کر پیتے مر گیا تو

مجھ رکھیل کا کیا بنے گا۔ میں اس کا جملہ مکمل کیا وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ میں سوچتا رہ گیا۔ اس عورت کو اتنا علم اور دانش کہاں سے ملی ہے؟ اس نے اتنی گہری نظر کس سے پائی ہے؟ وہ چہروں پر اتنا کچھ کیسے پڑھ لیتی ہے؟ اسے کان' آنکھ کھلی رکھنے اور دوسروں کا اعتماد حاصل کرنے کا فن کس نے سکھایا ہے؟ چلو چند ملاقاتیں اور ہوں گی تو اس کی زندگی کی ساری کڑیاں مل جائیں گی۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے؟

وہ شام کتنی گیلی' گندی اور بھیانک تھی۔ ہلکی سی بوندا باندی نے درختوں کے پتوں پر جمی ہوئی مٹی دھو کر سڑکوں پر پھیلا دی تھی۔ بارش کھل کے نہ برسے تو شہر کو اور میلا کر دیتی ہے۔ مطلع ابر آلود ہو تو رات نپٹ اندھی ہو جاتی ہے۔

کلب کا گرم گرم ماحول البتہ صاف ستھرا تھا ممبروں کے بوٹ اور سوٹ اور چہرے چمک رہے تھے معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ کوئی میز اور کوئی کمرہ خالی نہیں تھا پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کمی ہے۔ جیسے کلب کا سب سے بڑا شینڈ لیئر ابھی روشن نہیں ہوا۔ جیسے مینٹل پیس ابھی کوئی لایا نہیں' جیسے کلب کی شام ادھوری ہے۔ پہلے لوگوں نے ایک دوسرے سے سیٹھ نجیب کے بارے میں پوچھا' پھر سیٹھ نجیب کے حوالے سے مینو کی باتیں چھیڑیں اور آخر میں سب نے تکلف اور حجاب ترک کر دیا۔ عورتیں اور مرد سب کی زبان پر مینو کا

نام تھا۔ کچھ لوگوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ مینو شاید سیٹھ نجیب کے تیسرے پنجرے میں بند ہوگئی ہے۔ بعض لوگوں کو اندیشہ تھا کہ سیٹھ نجیب نے اپنی گرل فرینڈ تبدیل کرلی ہے۔ مگر کسی کو اپنی بات کا یقین نہیں تھا۔ وہ سب مینو کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی نظریں صدر دروازے پر لگی ہوئی تھی۔ مختلف ٹولیوں کی گپ شپ اور قہقہوں میں کہیں سے مینو بھی شریک ہوجاتی تھی۔ وہ شراب کی طرح مینو کے بھی عادی ہوچکے تھے۔

اور پھر مینو آئی مگر ایک انوکھے انداز سے اس کے چہرے کے پٹھے کھچے ہوئے تھے اس کے گریبان کا ایک بٹن کھلا ہوا تھا' اس کے ماتھے سے بندی غائب تھی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ نام کو بھی نہیں تھی۔ اس نے نہ دربان کے سلام کا جواب دیا اور نہ بیروں کے جھکے ہوئے سروں کی طرف دیکھا' وہ اس طرح ڈگ بھرتی بار کے کاؤنٹر پر پہنچی جیسے کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے۔ سب نے پلٹ کر دروازے تک دیکھا' سیٹھ نجیب اس کے ساتھ نہیں تھا۔

بار کاؤنٹر پر اس نے سٹول سنبھالا اور حکم دیا۔

وسکی ڈبل اینڈ آن دی راکس۔

بار مین جھجکا' مینو نے تو کبھی شراب نہیں پی تھی۔ وہ ''نمبر پانی'' کا ایک گلاس گھونٹ گھونٹ پی کر شام گزار دیتی تھی۔

سنا نہیں' ڈبل اینڈ آن دی راکس۔ اس نے اونچی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں غصے اور نفرت کے شعلے اگل رہی تھیں۔

بار مین نے گھبرا کر گلاس میں برف کے چند ٹکڑے ڈالے اور ان پر وسکی کی بوتل سے دو پیگ ناپ کر انڈیل دیئے۔ مینو نے گلاس اٹھا کر ہلایا' اس میں آئینہ دیکھنے کی کوشش کی اور ایک ہی سانس میں وسکی پی گئی' برف کے ٹکڑے اس کے دانتوں سے ٹکرائے اور گلاس میں گھوم گئے۔

ری پیٹ اٹ' دوبارہ بناؤ۔

بار مین کی آنکھیں ابھی تک پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ حیرت سے مینو کا منہ تک رہا تھا۔ سنا نہیں جلدی کرو۔ مینو نے ادھر ادھر ہاتھ مارا جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہے مگر آج وہ اپنا پرس بھول آئی تھی۔

بار مین نے دوسرا گلاس اٹھایا' اس میں برف ڈالی اور اس پر وسکی کے دو پیگ انڈیل دیئے۔ بار مین نے اتنی احتیاط برتی کہ سنک سے وسکی کو برف میں پھینٹا گلاس کو دو تین جھٹکے دینے کے بعد مینو کی طرف بڑھایا۔ اس نے ایک بڑا گھونٹ لیا تو کھانسی چھوٹ گئی۔ اس نے دوسرا گھونٹ لے کر اپر قابو پایا۔ چار گھونٹ میں گلاس بیکار ہوگیا۔

ایک اور بناؤ' اس کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند ہو گئی تھی وہ اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر تھی۔ بارمین نے آنکھیں جھپکیں اور گلاس اس کی طرف ایسے بڑھا دیا جیسے کہہ رہا ہو۔ اب جاؤ جان عزیز! موجوں پر سواری کرو۔ مینو اس کے چہرے پر لکھی ہوئی طنزیہ تحریر نہ پڑھ سکی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں ورنہ وہ تو چہرے پر نا تراشیدہ دھندلے اور ڈرے سہمے خیالات بھی پڑھ لیتی تھی۔

اس نے گلاس اٹھایا اور ابھی ایک گھونٹ اس کے حلق سے گزر رہی تھا کہ اس کے اردگرد حیرت زدہ لوگوں کا دائرہ تنگ ہونے لگا۔ اس نے بار کاؤنٹر کے سامنے لگے ہوئے آئینے میں غور سے دیکھا اور شیرنی کی طرح پلٹی۔ اس کی لال بھبھوکا آنکھیں دیکھ کر اکثر لوگ پیچھے ہٹ گئے۔

اے اور گنجے! مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو' جاؤ اپنی ماں بہن کو گھورو' وہ بھی میری جیسی ہی ہیں۔ تمہاری نظریں تو ان کے سامنے بھی نہیں جھکتی ہوں گی' ذلیل کہیں کے! مجھے یوں لگا جیسے اس آدمی کے سر کے بالوں کی طرح اس کے چہرے کے نقش بھی غائب ہو گئے تھے۔ مینو نے گلاس خالی کر کے حکم دیا۔ ایک اور بناؤ۔

اس مرتبہ بارمین نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا' نستعلیق قسم کا ایک آدمی آگے بڑھا اور مینو کے سامنے سے گلاس ہٹانے کی کوشش کی۔ میری جان تم اتنی وہسکی برداشت نہیں کر سکتیں۔

میری جان کے بچے! تم نجیب کی وہسکی ماں کا دودھ سمجھ کے پی جاتے ہو اور مجھے کہتے ہو میں دو پیگ برداشت نہیں کر سکتی۔ مفت خورا' بھکاری کہیں کا۔

نستعلیق آدمی نے اس طرح تڑپ کر اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ جیسے بچھو نے کاٹ کھایا جو اس کے چہرے کا رنگ پہلے سرخ اور پھر زرد پڑ گیا تھا۔

کلب میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ عورتیں اپنے شوہروں اور دوستوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر دوسرے کمروں میں لئے جا رہی تھیں۔ وہ سب رازوں سے خوفزدہ تھیں جو انہوں نے اس معصوم صورت کے پاس جمع کرا لئے تھے۔ وہ تو باؤلی ہو رہی تھی کسی کا بھی کاٹ سکتی تھی کچھ بھی بک سکتی تھی۔ وہسکی کے پے در پے رازوں کا لاکر توڑ رہے تھے' کئی کمزور دل مرد خود ہی دوسرے کمروں کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور میں حیران تھا کہ محبت اور شائستگی کی اس دیوی کا دل نفرت کا جوالا مکھی کیسے بن گیا ہے؟

مینو کے قدم ذرا ذرا لڑکھڑا رہے تھے' اس کا رنگ مراکشی گلاب کے پھول کی طرح دہک رہا تھا نہ بالکل سرخ' نہ بالکل گلابی! وہ

اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اس کا پیدائشی حسن بھی اس کے سامنے مات کھا گیا تھا' اس کے دونوں چہرے دو پتنگوں کی طرح میرے سامنے ڈول رہے تھے۔ مجھے اس کی حالت پر رونا بھی آ رہا تھا اور میں دہشت زدہ بھی تھا۔

ایک بھاری بھر کم شخص نے بڑھ کر اسے سہارا دینا چاہا تو اس نے پوری قوت سے اپنی کہنی اس کے پیٹ میں ماری' وہ تقریباً دوہرا ہو گیا اور راون کی اولاد! پولیس افسر ہو تو کسی کوٹھے پر چھاپہ مارو کسی اڈے سے منتھلی وصول کرو' کسی سیٹھ سے خرچہ لو مجھے روکنے کی تمہیں جرات کیسے ہوئی' میں تم جیسے دس افسر خرید کر نالی میں بہا سکتی ہوں اور پولیس افسر کا باکسر والا چہرہ بند گوبھی کا پھول بن گیا۔

ایک نوجوان دور کھڑا مینو کی حالت پر مزے سے مسکرا دیا تھا۔ وہ خود بھی کسی قدر مدہوش تھا۔ مینو کی نظر اس پر پڑی تو وہ غرائی' تم کیوں مسکرا رہے ہو پہاڑی کوے! تمہاری بہنیں تو سفارشی چٹھیاں بنی پھرتی ہی بے غیرت اور وہ نوجوان اپنی جگہ سے ایسا غائب ہوا جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا ہے۔

اب مینو کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی' پھر بھی جو کوئی اس کے سامنے آ رہا تھا' شرمندہ ہو کر اپنا منہ چھپا رہا تھا۔ ان میں اس کے کئی خاموش عاشق بھی تھے۔ سینکڑوں مزارعوں پر حکم چلانے والے جاگیردار بھی اور لاکھوں میں کھیلنے والے سرمایہ دار بھی اور وہ بھی جن کی چھڑی کے اشارے اور قلم کی جنبش سے آدمیوں پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی ان میں سے کئی ایک گونگوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ اس روز مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ عورت کی زبان کھل جائے اور وہ گالیاں دینے پر اتر آئے تو مرد اس کے سامنے نہتا ہو جاتا ہے۔ کبھی احمق لگتا ہے تو کبھی مظلوم۔

کوئی اور ہوتی' چاہے وہ کسی لاٹ صاحب کی بچی ہی کیوں نہ ہوتی' اتنی بے ہودگی کرتی تو لوگ اس کی ہڈیاں توڑ دیتے۔ وہ اپنے کچھ دانت کلب میں ہی چھوڑ جاتی مگر وہ تو مینو تھی۔ مینو! اس پر کس کا ہاتھ اٹھ سکتا تھا؟ اسے انگلی لگانے کی جرات کس میں تھی؟ اس کی پشت پر سیٹھ نجیب کے بے چہرہ غنڈے بھی قطار اندر قطار سب کو نظر آ رہے تھے اور پھر مینو نشے میں ضرور تھی مگر سچ اس کی زبان پر تھا۔

میں سوچ رہا تھا کاش مینو بھی پولی زینہ' انگلینہ یا اوفلیا ہوتی' یا وہ آج کلب نہ آئی ہوتی یا پھر میں ہی یہاں نہ ہوتا۔ میں تو اٹھ کر بھاگ بھی نہیں سکتا تھا میری ٹانگوں میں سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ میرے ہاتھ میز پر دھرے دھرے سن ہو گئے تھے میرا ماتھا پسینے سے سرد ہو رہا تھا۔ میں سحر زدہ تھا میں میز اور کرسی کی طرح لکڑی کا آدمی بن گیا تھا۔

ہال تقریباً خالی ہو گیا تھا کچھ لوگ دور شیشے کی دیواروں کا سہارا لئے کھڑے تھے' شاید میری طرح ان کا جسم بھی منجمد ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اور کچھ بولتی ہوئی میری میز کے قریب آئی تو میرے سارے بدن میں سرد لہریں اٹھنے لگیں' اس نے آنکھوں پر زور دے

کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے دھند میں سے جھانک رہی ہے' وہ اچانک چپ ہوگئی' اس کے ساتھ ہی سارا کلب کنویں میں اتر گیا' اس نے بڑی احتیاط سے اپنا گلاس میرے سامنے میز پر رکھا۔ میرے چہرے پر ویران سی نظر دوڑائی' قمیض کو بند کیا' دوپٹے کو اپنی گردن پر دو تین بار آرے کی طرح چلایا' پھر چھدراتی چال سے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کار کا دروازہ زور سے بند ہوا اور اس کا انجن چیخ کر سٹارٹ ہوا تو ساری زبانیں ایک ساتھ جاگ اٹھیں وہ سب ایک مال زادی کا کردار چاٹ رہی تھیں مگر بہت سی آوازوں کے شور میں بھی ایسا لگتا تھا کہ ہال میں رہ رہ کر ایک ہوک اٹھ رہی ہے' بعض لوگ صرف وسکی کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور بعض صرف سیٹھ نجیب کو! ایک مینو کو دوسری مینو نے زخمی ضرور کر دیا تھا مگر اسے قتل نہیں کر سکی تھی میرے سامنے میز پر رکھے ہوئے گلاس میں برف گھل گھل کر وسکی کا سنہرا رنگ ہلکا کر رہی تھی' گلاس کے گرد ہوا موتیوں کا جال بننے میں مصروف تھی۔

میں اٹھنے لگا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں فیل پا ہوں' میری ٹانگوں کی ہڈیوں میں لوہا بھر گیا ہے میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے گھسیٹا اور آہستہ آہستہ چل کر صدر دروازے تک پہنچا تو دربان اس طرح سر جھکائے کھڑا تھا جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا ملزم چشم دید گواہوں میں گھرا ہوا ہو' باہر نکلا تو بادل اپنے کو نچوڑ کر ہوا ہو گئے تھے۔ تاروں بھرے فیروزی قالین پر حیران چاند بنا بیٹھا تھا۔ سامنے سفیدے کے اونچے درخت چھدری چھتریاں تانے ہوئے تھے۔

وہ ڈراونی بھیانک شام کسی بدروح کی طرح کئی راتوں تک کلب میں گشت کرتی رہی' مگر نہ مینو آئی اور نہ سیٹھ نجیب' کلب آہستہ آہستہ اداس ہونے لگا' سب پوچھنے لگے کہ مینو کہاں گئی؟ وہ سب مینو کو معاف کر دینے کے لئے تیار تھے۔ اس کی ایک مسکراہٹ ساری شکایتیں دور کر سکتی تھی۔ کچھ روز کے بعد نجیب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ شہر کے ایک محدود کلب میں اپنی شامیں گزارتا ہے اس کلب کے ممبروں کی تعداد ہمیشہ سو سے کم رکھی جاتی تھی۔ کوئی بوڑھا ممبر اللہ کو پیارا ہوتا تو کسی خوش نصیب امیدوار کے لئے جگہ نکلتی تھی۔ اس لئے اطلاعات چھن چھن کر ہمارے کلب تک پہنچتی تھیں۔ سب سے اہم اطلاع یہ تھی کہ اب کوئی گرل فرینڈ سیٹھ نجیب کے بازو کا زیور نہیں تھی اور وہ بھی مینو کا اتا پتا نہیں جانتا تھا' وہ پہلے سے بھی زیادہ پینے لگا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ موٹا ہو رہا تھا۔ تجسس آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا اور بال آخر کلب کی فضا سے غائب ہو گیا' مینو ساون کی گھٹا کی طرح آئی تھی اسی کی طرح تیز ہوا پر سوار ہو کر چلی گئی تھی' صرف میں ایک تھا جسے کلب کے ایک گوشے میں بیٹھے بیٹھے وہ خوبصورت مسکراہٹ یاد آجاتی' جس میں محبت اور شفقت رچی بسی تھی۔

زندگی جیسے سیکنڈوں کی سوئی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے پل بھر میں سال گزر گیا' مجھے دفتر کے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر میں

جانا پڑا' ایک دکان سے سگریٹ خریدنے گیا تو سامنے وہی مہربان مسکراہٹ لہراتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو مینو نے میرا استقبال کیا۔

شاہد تم یہاں؟ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

مینو تم' تم تو ایسے غائب ہوئیں جیسے تمہیں کوئی یاد ہی نہیں کرتا۔ یہ جملہ میں نے جانے کتنی بار اپنے ذہن میں دہرایا تھا۔ زبان نے ویسے کا ویسا ہی اگل دیا۔

کیا بتاؤں' بات ہی ایسی تھی تم کیسے ہو' کلب کس حال میں ہے؟

سب نے تمہیں بہت یاد کیا' تم شہر چھوڑتے وقت سیٹھ نجیب ہی کو اپنا پتہ دے دیتیں۔

چھوڑو اس کم ظرف کی بات! اس نے تو میرا مان توڑ دیا' گھاس کا سانپ نکلا یہ جملہ اس نے ایسے ادا کیا جیسے وہ میرے تجسس کو اور تیز کرنا چاہتی ہے۔ میں نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ وہ صرف میرے سامنے ہی اپنے دل کی وہ آگ ٹھنڈی کر سکتی تھی جو کلب میں کب کی بجھ چکی تھی۔ اسے اگر میرے جیسا آدمی مل بھی جاتا تو وہ اس وقت کو واپس نہیں لا سکتی تھی' جس میں صرف میں ہی اس کا رازداں تھا عمر کے ہر لمحے کے ساتھ آدمی بھی پرانا ہوتا رہتا ہے یا نیا ہوتا رہتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ بڑھ یا گھٹ ضرور جاتا ہے اور مینو تو میری مقروض تھی اسے وضاحت کا قرض ادا کرنا تھا۔

اس نے میرے اصرار کا انتظار نہیں کیا وہ سال بھر سے جو بوجھ اپنے سر پر اٹھائے پھرتی تھی۔ اسے فٹ پاتھ پر کھڑے ہی سڑک پر پٹخ دیا۔ وہ کہہ رہی تھی نجیب کو دراصل غلط فہمی ہو گئی تھی۔ وہ سمجھتا تھا میں اسکی ران تلے آ گئی ہوں' وہ میرے ساتھ بھی رکھیل والا سلوک کر سکتا ہے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ وہ اپنے گندے ہاتھ میری صلیب سے دور رکھے مگر اسے تو جیسے ضد ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے رشوت دینے کی کوشش کی کہ مجھے ہیرے کی صلیب بنوا دے گا۔ تمہارے بعد وہ دوسرا آدمی تھا' جسے میں نے اپنی صلیب کی پوری کہانی سنائی مگر اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس کے لئے میرا ہر حال میں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ وہ بھوت بن گیا تھا۔ اس نے میری گردن پر سے زنجیر پکڑ کر اس طرح کھینچی جیسے اس کے سارے جذبات کی تسکین اس نازک سی زنجیر میں گندھی ہوئی ہے۔ اس کے غلیظ ہاتھ پہلی بار میری گردن تک پہنچے تھے۔ زنجیر میں جان ہی کتنی ہے' ٹوٹ گئی۔ میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اس کے ہاتھ پر اس زور سے کاٹا کہ وہ بلبلا اٹھا۔ اس کے مٹھی بھر بال پکڑ کر کھینچے اور اس کا سر صوفے کے ہتھے پر دے مارا۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے تو کبھی سوئی بھی نہیں چبھی تھی۔ اس لئے بہت نازک ہے۔ ذرا سی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا' کچھوا ہے کچھوا' ڈھال اتار تو نیچے میدہ ہی

میدہ ہے اس نے فٹ پاتھ ایک پاؤں اس طرح رگڑا جیسے نجیب کو مسل ڈالنے میں اسے مزہ آرہا تھا۔

میں وہاں سے نکلی تو میرا سر پھٹ رہا تھا۔ میری روح زخمی تھی' میرے سینے پر صلیب نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کلب کیسے پہنچی اور کس راستے سے پہنچی' شاید روز کا معمول تھا۔ کار ادھر کو ہی گھوم گئی۔ کلب میں کیا کچھ کہا؟ مجھے کچھ یاد نہیں' بس اتنا اندازہ ہے کہ کئی مہربان چہروں پر بھی میرے ناخنوں نے خون کی چھوٹی چھوٹی نہریں کھود دی تھیں اور تم مجھے ایسی دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے میں کوئی ڈائن ہوں اور تمہیں کچا چبا جاؤں گی۔ میں کلب سے بھاگ کر گھر پہنچی' تو نجیب نشے میں دھت تختہ بنا پڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں سے بھاگ رہی تھی۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا اور گھومتی گھامتی یہاں آ گئی۔

اس نے ساری تفصیل جیسے ایک ہی سانس میں سنا دی۔ بات ختم ہوئی تو اس کا چہرہ بے حد پرسکون ہو گیا اور اس کی مہربان مسکراہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔

''یہاں تم مینو ہو یا مریم؟'' نہ جانے یہ گندا سوال میری زبان پر کیسے اور کیوں آیا تھا؟

مینو نے مجھے غور سے دیکھا' اس کے چہرے پر حیرت اور غصے کا ملا جلا غبار پھیلا مگر وہ دوسرے ہی لمحے مسکرا دی۔

میں مینو ہوں' مینو آزاد پرندہ اور ہینڈ بیگ گھماتی ہوئی چلی گئی۔

◆◆◆

بلبلہ جسے دل کہیں

آج پھر وہ اطلاع دینے آئی تھی کہ شام کو اس کی شادی کی تاریخ مقرر کی جائے گی۔ اس بار وہ ذرا بھی شرماتی ہوئی یا گھبرائی ہوئی نہیں تھی۔ فتح کی پیاسی تلوار کی طرح چمکتی ہوئی طاہر کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔

اب تک خالدہ تین منگنیاں اور دو شادیاں بھگتا چکی تھی۔ پہلی منگنی تو ٹوٹنا ہی تھی' لڑکے والوں کی رال کٹوریوں کے حساب سے بہنے لگی تھی' بدنصیبوں کی ٹھوڑیاں لتھڑ گئی تھیں۔ دیکھ کے گھن آتی تھی۔ انہوں نے شادی سے پہلے ہی اپنے مال کے دام چڑھا دیئے تھے مگر خالدہ کی دونوں شادیاں بھی چھ چھ ماہ سے زیادہ نہیں چلی تھیں' شہر کی کئی کنواریاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں۔ ڈھائی سال میں تین مرد باری باری اسے اپنے نام کی انگوٹھی پہنا گئے تھے۔ اس کے ابا بہت بڑے بیوپاری ضرور تھے' کروڑوں کی اسامی سمجھے جاتے تھے اور خالدہ ان کی اکلوتی اولاد تھی مگر شہر میں ایسے کئی سیٹھ موجود تھے جو اپنی میلی شلواروں اور کچیلی بنڈیوں سمیت کروڑ کا طلسمی دائرہ پھلانگ چکے تھے۔ وہ بھی بیٹیوں کے باپ تھے اور اپنے ان دیکھے خوبصورت اور نیک سیرت دامادوں کا گھر بھر دینے کے لئے تیار تھے مگر ان کی بیٹیوں کی قسمت کسی طرح کھلتی ہی نہ تھی نہ منتیں مان کر نہ دعا کے لئے ہتھ پھیلا کر اور نہ جہیز کی رشوت کی جھلک دکھا کر' وہ اپنی بیٹیوں کے معصوم چہروں پر کرختگی کو اترتے ہوئے دیکھتے تو گھبرا کر ان کا ہاتھ اپنے جیسے کسی بھدے ہاتھ میں پکڑا دیتے۔ ایک خالدہ تھی کہ اپنے سجیلے دولہے میلے چیکٹ کپڑوں کی طرح اٹھا کر پھینک دیتی تھی اور اسے دلہن کا چھچھاتا ہوا نیا جوڑا تیار ملتا تھا۔

بات تو واقعی حیرت کی تھی' پہلی شادی تو چلو ٹھیک ہے' ہر کسی کی ہو جاتی ہے مگر دوسری اور اب تیسری اچھی خاصی خوبصورت لڑکی کو ایک بار طلاق کا کاغذ مل جائے تو لنگور صورت مرد بھی اسے سیکنڈ ہینڈ کہہ کر اپنا منہ اور ٹیڑھا کر لیتے ہیں' سیکنڈ ہینڈ روپیہ بھی قبول ہے' کار بھی اور شوہر بھی مگر سیکنڈ ہینڈ بیوی! واللہ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں؟ شیخ سعدی نے "زن بیوہ مکن گرچہ حور است" کا مشورہ مردوں کے لئے ہی چھوڑا ہے اور شیخ سعدی بڑے دانا بزرگ تھے' راہ چلتے میں حکمت کے موتی بکھیرتے رہتے تھے اور لوگ انہیں جھاڑ پھونک کر آنکھوں سے لگاتے تھے مگر خالدہ کے حسن اور اس کے ابا کی دولت کے سامنے شیخ سعدی کی دانش بھی مات کھا گئی تھی' نوجوانوں نے ان کی نصیحتوں پر کان دھرنا چھوڑ دیا تھا' بہت بوڑھے بھی تو ہو گئے تھے۔

طاہر کا گھر خالدہ کے ابا کی نئی کوٹھی کی بغل میں تھا' ویسے تو دونوں مکان ہی تھے رہنے کا ٹھکانہ' مگر راجہ بھوج اور گنگوا تیلی بھی

انسان ہی تھے‘ دو ٹانگوں پر چلنے والے گوشت پوست کے حیوان‘ پھر بھی دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں تھا‘ طاہر کا مکان چالیس مرلے میں تھا اور خالدہ نے ابا کی کوٹھی نے چار سو مرلے زمین گھیر رکھی تھی طاہر خوش نصیب تھا کہ دور پار سے خالدہ کا رشتہ دار بھی تھا۔ اسے اگر گنگوا تیلی کہا جاتا تو راجہ بھوج کی ذات پر بھی حرف آتا۔ اس لئے خالدہ اپنے ابا اور امی کے ساتھ جب نئی کوٹھی میں آئی تھی تو ان کے لئے رات کا کھانا طاہر کے گھر سے آیا تھا۔ خالدہ کبھی کبھی سوچتی تھی کہ اس کے ابا اگر یہ کوٹھی فوراً خرید لیتے تو کتنا اچھا ہوتا‘ اس وقت تو طاہر کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی مگر اس کے ابا تو پکے بیوپاری تھے۔ نوٹوں کا لحاف اوڑھ کے سوتے تھے۔ اس کوٹھی کا سودا کرنے میں بھی انہوں نے دو سال لگا دیئے تھے‘ انہیں شروع دن سے یقین تھا کہ شہر میں ان کے سوا کوئی شخص بھی اتنا مہنگا محل نہیں خرید سکتا۔ بنانے والے نے دل کھول کر خرچ کیا ہے۔ ولایتی سامان سے سنگ مرمر کی ایک کان سجادی ہے مگر اب مجبور ہے کب تک بینکوں کو ٹالتا رہے گا۔ ایک دن میری لگائی ہوئی قیمت پر اپنا خواب گھر بیچ دے گا۔ آخر یہی ہوا تھا کوٹھی کے مالک نے پورے تین لاکھ روپے چھوڑ دیئے تھے۔ اس وقت خالدہ اپنے ابا کی کاروباری سوجھ بوجھ کی قائل ہوگئی تھی مگر اب جانتی تھی کہ باپ بیٹی کو یہ سودا بہت مہنگا پڑا ہے۔ تین لاکھ سے کہیں زیادہ رقم تو اس کی منگنیوں اور شادیوں کے محض دکھاوے پر اٹھ چکی ہے۔

خالدہ نے اپنی امی اور ابا سے طاہر کا سرسری ساذکر تو سن رکھا تھا مگر اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ان کی پہلی ملاقات نئی کوٹھی میں ہوئی تھی‘ جہاں طاہر اپنی بیوی اور اماں کو لے کر اس کے ابا کو سلام کرنے آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی خالدہ کو ایسا لگا تھا جیسے وہ طاہر کو برسوں سے جانتی ہے اور اس کی ہر ادا سے واقف ہے‘ طاہر کو بھی شاید ایسا ہی محسوس ہوا تھا کیونکہ وہ بھی خالدہ سے فوراً بے تکلف ہوگیا تھا اور دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی بیمار بیوی پہلو بدل بدل کر چلنے کے اشارے کررہی تھی اور وہ بات سے نکال کر گفتگو کا تار ٹوٹنے ہی نہیں دیتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد خالدہ خواہ مخواہ مسکراتی رہی تھی۔ اسے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ کوئی کیسے چپکے سے دل میں اتر جاتا ہے اور نشہ بن کے رگوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ اس نے اپنے رشتہ داروں اور ابا کے دوستوں میں یہ پہلا شخص دیکھا تھا جس کا ماتھا تانبے کا اور ٹھوڑی کانسی کی نہیں تھی اور جس نے نوٹوں کی گڈیاں گن گن کر اپنے ہونٹ کالے نہیں کئے تھے دوسرے دن اس نے طاہر کے گھر میں ناشتہ کیا تھا۔

طاہر اب اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیوی کا انتقال ہوئے بھی دو برس گزر چکے تھے۔ وہ اب بالکل تنہا تھا۔ اس کی بیوی جب زندہ تھی تو اس وقت بھی خالدہ سوچا کرتی تھی کہ طاہر اگر مان جائے تو وہ اس کی دوسری بیوی بننے کو تیار ہے آخر اس کے چچا اور پھوپھا کی بھی دو دو بیویاں تھیں اور خالو تو بیٹے کی جستجو میں تین شادیاں کرچکے تھے۔ ان کا بیٹا بلا کا اڑیل ٹٹو لا تھا‘ کسی طرح پیدا ہو کے

نہیں دیتا تھا۔ اب وہ چوتھی بیوی لانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کے گھروں میں ہر وقت دنگا فساد ہوتا رہتا تھا مگر ان نپٹ ان پڑھ بیویاں خود ہی سیمی کے کانٹے تھیں' سونے کی چوڑیوں ہیرے کے ہاروں اور کم خواب کے کپڑوں پر لڑتی رہتی تھیں۔ طاہر کی بیوی تو اس کی طرح پڑھی لکھی ہے۔ دونوں سہیلیاں بن جائیں گی۔ اگر اس نے قبول نہ کیا تو کوئی بات نہیں ہے۔ طاہر کے گھر میں پانچ کمرے تو ہیں' وہ بھی کسی ایک میں پڑ رہے گی' خالدہ اپنے اس خیال کو اگر لفظوں میں ڈھالتی تو اس کی زبان ہی جل جاتی' مگر طاہر کی بیوی کی چھٹی حس آپ ہی آپ پھڑک اٹھی تھی۔ خالدہ اس کے گھر میں قدم رکھتی تھی تو وہ نفرت سے منہ پھیر لیتی تھی مگر خالدہ کو سامنے پا کر طاہر کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ خالدہ کو مگن رکھنے کے لئے کافی تھی' اس کی خاطر زمانے بھر کی ہتک بھی ہنس کے برداشت کی جا سکتی تھی۔

ڈیڑھ برس پہلے ایک رات کو خالدہ کے پیٹ میں اچانک ایسا شدید درد اٹھا تھا کہ اس کی چیخیں اتنا بڑا محل بھی پھلانگ گئی تھیں۔ بیٹی کو تڑپتا ہوا دیکھ کر ماں باپ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ نوکر چاکر بھی گھبرا کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے تھے کسی کو ڈاکٹر کا ٹیلی فون نمبر ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس وقت طاہر کو بلوایا گیا۔ وہ اسے اپنی گاڑی میں ہسپتال لے گیا تھا۔ کار کی پہلی نشست پر لیٹتے ہی خالدہ کا درد مدھم پڑنے لگا تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ طاہر ہسپتال کا راستہ بھول جائے یا پھر ہسپتال کے پہیے لگ جائیں اور وہ بس کی طرح بھاگنے لگے اور طاہر اسی طرح اسے گھوم گھوم کر دیکھ رہا ہے اسے دو تین بار تو طاہر پر غصہ بھی آیا کہ وہ گاڑی اتنی تیز کیوں چلا رہا ہے۔ کیا اسے اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے؟

ہسپتال اپنی جگہ قائم تھا' طبی معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ خالدہ پیٹ میں رسولیاں ہیں اور انہیں فوراً نکال دینا چاہیے۔ ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے نکلا تو اس کے ابا سے کہنے لگا آپریشن تو کامیاب رہا ہے مگر رسولیاں دوبارہ بھی بن سکتی ہیں اور دوسرا آپریشن خطرناک ہو سکتا ہے۔ آپ جلدی سے اپنی بیٹی کی شادی کر دیجئے۔ اس کے پیٹ میں بچہ آئے گا تو رسولیاں بننے کا خطرہ نہیں رہے گا۔ اس نے چلتے چلتے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ مریضہ کو اس بیماری کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا جائے اس پر بہت برا نفسیاتی اثر پڑ سکتا ہے۔ وہ خوف سے کھانا پینا چھوڑ سکتی ہے۔ ہسٹیرک ہو سکتی ہے' کسی بھی فوبیا میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ اس لئے خالدہ سے کہا گیا تھا کہ اس کی اپنڈے سائی ٹس' اندھی آنت میں انفیکشن تھی۔ ڈاکٹروں نے یہ فضول چیز نکال دی ہے' اب کوئی خطرہ نہیں ہے یہ خوشخبری سننے سے پہلے بھی خالدہ خوش تھی۔ طاہر اسے روز دیکھنے آتا تھا اور اس کے لئے ڈھیر سے پھول لاتا تھا۔ وہ لیٹے لیٹے اپنی نظروں سے پھول سونگھتی تھی اور ان میں طاہر کی خوشبو پا کر ساری تکلیف بھول جاتی تھی۔

ہسپتال سے واپس آئی تو اس کے ابا موزوں رشتہ ڈھونڈنے میں اس طرح جٹ گئے جیسے وہ چند دنوں میں بوڑھی ہو جائے گی۔ اس کے سر کے بالوں میں سفید تار چمکنے لگیں گے اور پھر اس سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ اس کی امی اور ابا دونوں مل کر اس کی پہلی منگنی توڑنے پر افسوس بھی کیا کرتے تھے۔ لالچی لوگ تھے' ان کا منہ بھرنے کے لئے اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے' ہم خواہ مخواہ ان کے مطالبوں سے چڑنے لگے تھے' جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے۔ اس کے ابا کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ان کے اضطراب پر حیران تھی کہ آخر ایسی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو ایم۔ اے کے امتحان میں بھی ڈیڑھ سال باقی ہے۔ ابا کی لاڈلی ہونے کے باوجود وہ اس موضوع پر ان سے بات نہیں کر سکتی تھی لیکن دل ہی دل میں ڈرتی بھی رہتی تھی کہ کہیں طاہر کو نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ ابا کی عجلت دیکھ کر ایک دن اس سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنی امی کے کان میں اپنی خواہش پھونک دی۔ رشتہ تو طاہر کی ماں کو لے کر آنا چاہیے تھا مگر طاہر تو برف کے کپڑے پہنے پھرتا تھا۔ اس کے گھر سے پیام نہ آیا تو خالدہ کی امی نے منت سماجت کر کے اپنے شوہر کو تیار کیا وہ طاہر کے گھر چلیں اور خود ہی بات چھیڑیں خالدہ کے ابا چاہتے تو طاہر کے گھر سمیت اس کی ساری جائیداد اور کاروبار خرید کر اپنے کسی منشی کے حوالے کر دیتے مگر بیٹی کی خواہش اور اس کی بیماری کا معاملہ تھا' انہوں نے مونچھ نیچی کر لی' طاہر کی ماں کی تو باچھیں کھل گئیں اسے اپنے دروازے پر ہاتھ جھولتے ہوئے نظر آنے لگے۔ جی بسم اللہ! کا ورد کرتے کرتے اس کا حلق ہلکے ہلکے خشک ہونے لگا لیکن طاہر آیا تو اس نے اتنی خوبصورتی سے انکار کیا کہ خالدہ کے ابا ہلکے پھلکے ہو کر واپس آئے۔ ان کے دل میں طاہر کی عزت اور بڑھ گئی' انہیں تو یہ رشتہ ویسے بھی پسند نہیں تھا۔ انہوں نے طاہر کو اپنی بیٹی کی آنکھ سے کب دیکھا تھا۔

طاہر نے جس رات کی شام کو انکار کیا تھا۔ وہ رات خالدہ نے بڑے کرب میں گزاری تھی۔ وہ بیس سال کی ہو چکی تھی مگر اس کے اندر کا بچہ ابھی تک اپنی ٹانگیں اچھال رہا تھا' اس نے مچل مچل کر خالدہ کو بہت رلایا تھا' اس کا پیارا سا کھلونا چھین کر چھت سے جو لٹکا دیا گیا تھا۔

دوسرے دن وہ صبح صبح طاہر کے گھر گئی تھی' طاہر کی ماں شرمندہ سی تھی' لیکن طاہر کے رویے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک جوں کی توں موجود تھی جو خالدہ کے تن بدن میں بجلی کی طرح گھوم جاتی تھی اور اسے آہستہ آہستہ شیر گرم پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں لٹا دیتی تھی۔ وہ طاہر کے گھر سے اور زیادہ حیران ہو کر لوٹی تھی' دن بھر سوچتی رہی تھی کہ طاہر کیسا آدمی ہے؟ اگر اس سے پیار کرتا ہے تو وہ دروازے پر کھڑی دستک دے رہی ہے چٹخنی اتار دے تو وہ خود بھاگ کر اس کے سینے سے لگ جائے گی مگر وہ تو بہرا گونگا قفل بن گیا ہے کہیں یہ سب کچھ محض ایک غلط فہمی تو نہیں ہے؟

امی کی منتوں' ابا کے اصرار اور طاہر کا رویہ دیکھ کر خالدہ شادی کرنے کو تیار ہو گئی تھی' اس نے ماں باپ کی پسند قبول کر لی تھی' اسے یقین تھا کہ یہ اطلاع طاہر پر بجلی بن کے گرے گی اور وہ اس کے ابا کے پاؤں چھو کر اس کا ہاتھ مانگے گا مگر طاہر پر تو ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ شادی کے انتظامات کرنے میں اس کے ابا کا ہاتھ اس طرح بٹا رہا تھا' وہ جیسے بھی کوئی رولدو محمد دین ہے۔ اس کا کام قناتیں لگانا' قالین بچھانا اور دولہا دلہن کے بیٹھنے کے لیے اسٹیج سجانا ہے۔

شادی کا دن قریب آتے دیکھ کر خالدہ کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ اس پر تشنج کے دورے پڑنے لگے تھے' وہ الٹ پلٹ کر رہ جاتی تھی' رخصتی کے وقت وہ دلہن سے زیادہ مریضہ لگ رہی تھی جو علاج کرنے کے لیے ہسپتال جا رہی ہے۔

شادی کے بعد وہ میکے میں چند دن گزارنے آئی تو طاہر کو ویسا ہی پایا جیسا چھوڑ کر گئی تھی مگر وہ چھوڑ کر کب گئی تھی؟ وہ تو اس کے دل اور دماغ میں ڈیرے ڈال کر بیٹھا ہوا تھا' وہ آنکھیں بند کرتی تھی تو وہ اس کے پاس آ جاتا تھا' وہ آنکھیں کھولتی تھی تو سائے کی طرح اس کے سامنے گھومنے لگتا تھا۔ وہ کبھی کبھار پیار سے اس کے کندھے پر جہاں ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ وہ وہیں نقش ہو گیا تھا۔ اس کی گردن نے طاہر کی کچھ سانسوں کی نمی اسفنج کی طرح چوس رکھی تھی۔ جب نچوڑتی تھی ایک آدھ بوند ٹپک کر اس کے جسم پر پھیلنے لگتی تھی۔ وہ اس اجنبی کو ذرا سا بھی پیار نہ دے سکی تھی جو اسے بڑی چاہ سے بیاہ کر لایا تھا' اس کے لیے وہ برف کا بت تھی اور اپنے لیے ہلکی آگ میں سلگتا ہوا ایک پتلا! جہیز اور بری میں اسے خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں ملا تھا۔

ایک دن اس نے لیٹے لیٹے سوچا تھا کہیں میں نے شادی کرنے میں جلدی تو نہیں کی' ہیلمٹ کی ماں کی طرح! اس نے ہیلمٹ کو اتنی مہلت نہ دی تھی کہ وہ اپنے باپ کی موت کا صدمہ جذب کر لیتا۔ کالج کی لیکچرار مذاق سے کہتی تھی کہ ہیلمٹ کی ماں بڑی اتاولی تھی۔ وہ اگر مادر شاہ بن جاتی تو ہیلمٹ کو اپنے باپ کے قتل کی سازش کا علم ہی نہ ہوتا' ڈنمارک کے اس شہزادے کی تاجپوشی کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ اس کے کانوں میں دربار کے امراء اور سالار مختلف برانڈ کی خوشامد کا تیل ٹپکانے لگتے اور حرم سرا میں لونڈیاں اور باندیاں اس کا دل بہلائے رکھتیں' باپ کی روح قلعے کی فصیل سے ٹکریں مار مار کر بیدم ہو جاتی' فرزند رشید کو محل سے قدم نکالنے کی فرصت ہی نہ ملتی' اور شیکسپیئر کا ڈرامہ چار سطروں میں ختم ہو جاتا یا پھر بیٹے کی نمک حرامی کا نوحہ بن جاتا اس تشریح پر ساری کلاس خوب ہنسی تھی۔ ہیملٹ کی ماں تو باؤلی ہو رہی تھی' اسے ملکہ کا تاج بھی چاہیے تھا اور جیٹھ سے شادی بھی وہ اس وقت ہیملٹ کے جذبات کے بارے میں کیا سوچ سکتی تھی؟ لیکن میں تو سوچ سکتی ہوں' طاہر اپنی بیوی سے پیار کرتا تھا' اس کی موت پر غم سے نڈھال ہو گیا تھا۔ وہ اتنی جلدی دوسری شادی کیسے کر لیتا؟ مگر وہ تو اپنی بیوی کی موجودگی میں بھی مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔ اسی لئے

تو مرنے والی مجھ سے جلنے لگی تھی کیا یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی بیک وقت دو تین عورتوں سے پیار کرے؟ جس طرح دو تین بھائیوں سے دو تین دوستوں سے اور ہاں دو تین بہنوں سے بھی اور دو تین بیویوں سے بھی کسی کم اور کسی سے زیادہ! مگر پیار تو پیار ہی رہتا ہے' پانی تو پانی ہی کہلائے گا' تالاب میں ہو' جھیل میں ہو یا سمندر میں ہو' میں تھوڑی دیر انتظار کر لیتی تو سب ٹھیک ہو جاتا۔

اس خیال نے خالدہ کو اس طرح وہ جھٹکا دے کر جگا دیا تھا جیسے اسے کوئی بشارت دے دی گئی ہے' وہ اپنے شوہر سے بات بات پر جھگڑنے لگی تھی۔ اس کے گھر والوں کو برا بھلا کہنے لگی تھی۔ اس کے دوستوں پر الزام دھرنے لگی تھی۔ آتے جاتے میں اپنے خاوند سے کہتی تھی' کیا گھوس کا سامنہ لئے پھرتے ہو۔ ایک دن اسے بھی تاؤ آ گیا تھا آخر تو مرد ذات تھا اپنی بیوی کی زبان سے کب تک اپنی صورت اپنی عقل اور اپنے خاندان کی برائی سن سکتا تھا؟ اس نے بھی پنجے کھول لئے تھے خالدہ نے اس کے طعنے خوب نمک مرچ لگا کر اپنے ابا کو سنانے تھے۔ ان کا دل بھی اپنے داماد کی طرف سے اتنا کھٹا ہو گیا تھا' کہ وہ بھی اسے سگ دماغ' بدزبان اور بھڑ بھونجا کہنے لگے تھے ایک دن جب خالدہ اپنا سارا زیور سمیٹ کر اپنی کار میں واپس آئی تھی تو اس کے انتظار میں باپ کے گھر کا دروازہ کھلا تھا لیکن اس کے شوہر پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا تھا۔

خالدہ کو یقین تھا کہ طاہر اس کی طلاق کی خبر سن کر خوشی سے جھوم اٹھے گا مگر وہ تو بالکل بجھ گیا تھا۔ خالدہ سے کھچا کھچا رہنے لگا تھا ادھر خالدہ نے اس کے گھر میں قدم رکھا ادھر اسے کوئی ضروری کام یاد اور وہ گھر سے نکل گیا' خالدہ حیران تھی کہ اب تو ان کے درمیان کوئی تیسرا بندہ نہیں ہے' پھر وہ اس سے کیوں دور بھاگتا ہے؟ اس کی بوڑھی ماں کب تک اس کا گھر سنبھالے گی؟ اسے ایک نہ ایک دن تو شادی کرنا ہی ہوگی پھر وہ آج ہی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتا؟ زندگی تو چھوٹی سی چیز ہے۔ چار دن میں ختم ہو جاتی ہے' وہ اسے کیوں ضائع کر رہا ہے؟ وہ اب پہلی سی خالدہ نہیں رہی تھی' ایک کھرتل عورت بن گئی تھی' اپنے سابق شوہر اور اس کے ہوتوں سوتوں سے چوکھی لڑتے لڑتے اس کی زبان گز بھر کی ہو گئی تھی مگر طاہر کے سامنے مطلب کی بات کہتے وقت گونگی ہو جاتی تھی' اس کی آواز دل کی دھڑکن بن جاتی تھی' جسے سننے کے لئے سٹیتھس کوپ درکار ہوتی ہے۔ وہ اٹھ کر گھر سے نکل جاتا تھا اور وہ بے بسی سے بیٹھی اسے یوں دیکھتی رہ جاتی تھی' جیسے اس کے قدم گن رہی ہے۔

خالدہ طاہر کے رویے کا تجزیہ کرتی رہی تھی اور اس کے ماں باپ دوسرے داماں کی تلاش میں بھاگتے رہے تھے۔ انہیں دو ہتا چاہیے تھا ان کی بیٹی زندگی کا محافظ اور اس کے پیٹ میں بننے والی رسولیوں کا معالج' ان کی تگ و دو کامیاب رہی تھی' انہیں ایک اچھے گھر کا ایک اچھا صحت مند لڑکا مل گیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ خالدہ اس کے ساتھ خوش رہے گی اور موت سے مقابلہ کرنے میں وہ خالدہ

کی مضبوط ڈھال ثابت ہوگا۔

خالدہ نے یہ خبر طاہر کو سنائی تو وہ اس طرح خوش ہوا تھا جیسے اس کی اپنی شادی ہو رہی ہے' اس کے رویے سے خالدہ کے اردگرد پھر میٹھی میٹھی دھوپ پھیلنے لگی تھی اور وہ حیرت کے کنویں میں غوطے کھاتی ہوئی گھر واپس آئی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں اور اپنی عقل پر شبہ ہونے لگا تھا۔ اسے کئی بار یہ گمان گزرا تھا کہ وہ پاگل ہو رہی ہے' سوہنی کی طرح کچے گھڑے پر سوار ہو کر دریا پار کرنا چاہتی ہے' سسی کی طرح صحرا میں تپتی ہوئی ریت پر بھاگ رہی ہے اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا اس کی چیخیں نگلتی چلی جا رہی ہے آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ تو ہیر بنے گی' عشق اپنی جگہ' بیاہ اپنی جگہ' رانجھا جوگی بن کر جوتیاں چٹخاتا ہوا خود ہی اسکے پاس پہنچ جائے گا' کتنی ہی عورتیں ہوتی ہیں جن کے دل میں شوہر کے علاوہ بھی کوئی آدمی چھپ کے رہتا ہے۔ وہ اچھی ہیں یا بری۔ وہ بھی ان میں شامل ہو جائے گی۔ وہ تھوڑی دیر کو بھول گئی تھی کہ اس کے دل کے اردگرد تو طاہر کی تصویر لپٹی ہوئی ہے' اسے کھرچ کر کسی دوسری تصویر کے لئے بنائی جا سکتی ہے اور دل کو کھرچا جائے تو وہ بلبلے کی طرح پھٹ جاتا ہے۔

خالدہ نے ماں باپ کی پریشان صورتیں دیکھ کر ان کی پسند پر ہاں کر دی' پر اس کا دل کہتا تھا کہ وہ غلطی کر رہی ہے' اسے انتظار کرنا چاہیے۔ بعض پھول صرف سمندر کی تہہ میں کھلتے ہیں۔ انہیں پانے کے لئے وقت اور ہمت چاہیے مگر وقت کہاں تھا' بارات آ چکی تھی' اس نے دلہن کا جوڑا پہنتے ہوئے جھلا کر کہا تھا نہیں ہوتی مجھ سے روز روز کی یہ ایکٹنگ بس بہت ہوگئی تیاری۔

خالدہ کی دوسری شادی نے اس کی پہلی شادی سے بھی کم عمر پائی تھی۔ اس کا شوہر اور اس کے سسرال والے ہر دم اسکی نازبرداریوں میں لگے رہتے تھے مگر وہ کسی سے سیدھے منہ بات کر کے نہ دیتی تھی۔ ہر وقت بیزاری نظر آتی تھی' آہستہ آہستہ اسے اپنا شوہر بھی زہر لگنے لگا تھا وہ اپنی دیہاتی ساس اور گنوار نندوں اور جٹھانیوں میں جوؤں کی طرح چن چن کر عیب نکالتی تھی اور سچی یا فرضی جوں کو اپنے انگوٹھوں کے ناخنوں کے درمیان اس زور سے مسلتی تھی کہ پٹاخ کی آواز سن کر سارا گھر حواس باختہ ہو جاتا تھا' اس کے دولہا نے اپنی دلہن کو خوش کرنے کے لئے اپنا کاروبار اور دوست احباب بھی بھلا دیئے تھے مگر وہ اپنے سر کے تاج سے باسکٹ بال کھیلتی رہتی تھی۔

خالدہ سے باتیں کرتے ہوئے اس کے شوہر کو کئی بار احساس ہوا کہ وہ حاضر نہیں ہے' وہ کہتا کھیت کی تھا اور سنتا کھلیان کی تھا' مگر سادہ لوح تھا یا خالدہ سے سچ مچ محبت کرنے لگا تھا' سوچتا تھا کہ اس کی بیوی بڑے گھر سے آئی ہے' یہاں اس کا جی لگ نہیں رہا۔ وہ اس کا جی بہلانے کے لئے نکاح نامے سے نتھی ہو کر رہ گیا تھا مگر محض نکاح نامے سے کیا ہوتا ہے' صرف وہی تو دل بہلانے کے لئے کافی

نہیں ہے لیکن وہ بیچارہ بھی کیا کرتا؟ خالدہ کا رواں رواں تو طاہر کو پکار رہا تھا وہ اپنے بھولے بھالے شوہر میں بھی طاہر کو تلاش کرتی تھی اور وہ جب نہیں ملتا تھا تو کبھی رنجیدہ ہو جاتی تھی اور کبھی بھلا اٹھتی تھی رفتہ رفتہ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے وہ ہسٹیرک ہونے لگی تھی اسے تو مرد ذات صرف اس لئے گوارا تھی کہ طاہر بھی مرد ہے' اگر طاہر ہی نہیں ہے تو پھر سارے مرد جائیں بھاڑ میں۔

ایک دن وہ اپنے شوہر کو بھاڑ میں جھونک کر طاہر کے قریب آ گئی تھی۔ پانی سے دور رہ کر مچھلی کو زندگی میں تو کبھی چین نہیں ملتا۔

خالدہ کی واپسی کی خبر سن کر طاہر پر برف گرنے لگی تھی۔ وہ اس سے کترانے اور نظریں چرانے لگا تھا۔ اس بار تو اس نے حد کر دی تھی۔ اس کے ابا کے پاس جا پہنچا تھا یہ مشورہ دینے کہ روز روز کی طلاق اچھی نہیں ہوتی۔ کوشش کر کے میاں بیوی میں مصالحت کرا دیجئے۔ دونوں کو کچھ دنوں کے لئے یورپ بھیج دیجئے۔ آب و ہوا اور ماحول تبدیل ہو گا تو خالدہ کا دل بہل جائے گا۔ مشورہ تو نیک تھا مگر خالدہ کے ابا اپنی بیٹی کو جہنم سے نکالنے کی قیمت بھی ادا کر چکے تھے۔ لڑکا چنتے وقت ان کی آنکھوں پر جانے کیسے پردہ پڑ گیا تھا۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ اس گھر میں تو ماں باپ کے علاوہ درجن بھر بھائی اور بہنیں رہتی ہیں۔ ہر وقت کی دانتا کلکل کے باوجود وہ ایک ہی کنبہ ہیں۔ لڑکے اپنی بیویاں اور لڑکیاں اپنے شوہر لے کر اسی گھر میں آ جاتی ہیں' ایسے چڑیا گھر میں خالدہ کیسے رہ سکتی ہے؟

خالدہ کو طاہر کا مشورہ معلوم ہوا تھا تو وہ ایک بار تو جل کر کوئلہ ہو گئی تھی۔ وہ اس کے قرب کو تڑپ رہی تھی اور وہ اسے دیس نکالا دینے کی صلاح دے رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ واپس جائے اور اپنے بھولے بھالے بدھو سے شوہر کے پاؤں پکڑے' اس سے معافی مانگ کر اسکی بیوی بن جائے۔ مگر طلاق ہو جانے کے بعد یہ کام ایسا آسان نہیں تھا' رجوع سے پہلے اسے ایک اور شخص کو اپنا میاں ماننا پڑے گا۔

خالدہ کے ماں باپ کی پریشانی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کا اترا ہوا چہرہ دیکھتے تھے تو کانپ اٹھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کے پیٹ میں موت پل رہی ہے اور اس کی زندگی ان کا داماد اور دوہتا ہی بچا سکتا ہے۔ وہ موزوں لڑکے کی تلاش میں اور زیادہ بھاگنے دوڑنے لگے تھے۔ ادھر خالدہ تھی کہ طاہر کو پٹانے کے لئے وہ سارے ناز و انداز اور چرتر آزما رہی تھی جو اس کی دو شادیوں کے تجربات اور دوسرالی گھرانوں کے مشاہدات کا نچوڑ تھے' مگر طاہر تو ایسا پتھر بن گیا تھا جس پر باد و باراں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ خالدہ نے کئی بار قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی صورت اور اپنے جسم کا جائزہ لیا تھا اور ہر بار اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مرد کو اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔ مرد کو اس سے زیادہ کچھ نہیں مل سکتا۔

ایک روز وہ آئینے کے سامنے اسی مشق میں مصروف تھی کہ اپنے ایک خیال پر خود ہی ہنس دی تھی۔ اللہ میاں ذرا سے چوک گئے'

مجھے اگر طاہر بنا دیتے اور طاہر کو خالدہ تو میں اسے فوراً اپنا لیتی' یوں دن اور مہینے ضائع نہ کرتی لیکن اب کیا ہو سکتا ہے' میں عورت رہوں گی اور وہ مرد اور فیصلہ اسی کو کرنا ہے۔ بے بسی کے احساس نے اس کے چہرے سے مسکراہٹ مٹا دی تھی۔ وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر سامنے پھیلے ہوئے سبزہ زار کو دیکھنے لگی۔ لان کے ایک کونے میں لاجسٹونیا کے ریشمی گلابی پھول جھوم جھوم کر گل چینی کے دو گھوڑا بوسکی پھولوں سے گلے مل رہے تھے۔ ان کی یہ حرکت دیکھ کر جیکو رنڈا کی جامنی کلیاں شرم سے دہری ہو کر ہوا میں اڑ رہی تھیں ذرا فاصلے پر انجیر کا درخت تھکے ماندے پہلوان کی طرح خراٹے لے رہا تھا۔ اس کا ایک زرد روپتہ ہوا کے بوجھ سے ٹوٹ کر کئی چوڑے چوڑے سبز پتوں اور موٹی موٹی بھوری شاخوں سے ٹکرایا اور بے ڈھنگے پن سے چکر کاٹتا' الٹتا پلٹتا دھول میں جا گرا' خالدہ نے کھڑکی فوراً بند کر دی تھی۔

تیسری شادی کی بات چلی تو خالدہ نے کئی بار تیز تیز نظروں سے طاہر کا چہرہ کنگھالا مگر وہ ہر بار خالی برتن کی طرح بجتا ہوا محسوس ہوا۔ ماں بیٹی کے دل سے واقف تھی۔ اس نے سمجھایا سائے کے پیچھے بھاگ بھاگ کر زندگی تو برباد کی جا سکتی ہے مگر سائے کبھی کسی کے ہاتھ نہیں آئے۔

کیسے نہیں آئے خالدہ نے تن کر جواب دیا۔ امی' آپ مجھے نہیں جانتیں میں سائے کو نہیں سائے والے کو دبوچ لوں گی۔

ماں نے حیران ہو کر بیٹی کی طرف دیکھا' بیٹی اب بچی نہیں تھی کھیلی کھائی عورت تھی۔ دو دو شوہروں کو چلتا کر کے ماں سے بھی سینئر ہو گئی تھی۔ ماں بے چاری تو ایک ہی شوہر کا دامن تھامے بوڑھی ہو چلی تھی۔ وہ بیٹی کے سامنے کیا بول سکتی تھی' صرف دعا دینے کے قابل رہ گئی تھی۔

آج وہ پہاڑ سر کرنے کا عزم لے کر طاہر کے گھر میں داخل ہوئی' طاہر اس کے تیور اور طنطنہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ اتنی تیزی سے اٹھا کہ کرسی منہ کے بل گر پڑی' وہ کندھے اٹھا کر اس طرح دروازے کی طرف بھاگا جیسے ہوائی حملے کا سائرن بج گیا ہو خالدہ نے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ وہ اس کے سامنے اس طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو اور چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ اس کی ماں سامنے بیٹھی تھی۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ خالدہ اس کے جوان بیٹے کو آٹے کی تھیلی کی طرح گھسیٹ کر کمرے میں لے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ طاہر کے ہاتھ پاؤں میں جان نہیں ہے' وہ لوتھ کا لوتھ گھسٹتا چلا جا رہا ہے۔

خالدہ کا دوپٹہ کمرے کی دہلیز پر گرا اور وہیں بل کھا کر پہرا دینے لگا۔ اس کے گریبان کا بٹن ٹوٹ کر کسی کونے میں جا چھپا مگر آج خالدہ کو کسی بات کی پرواہ نہیں تھی' اس کے دل میں تین سال سے جو طوفان اٹھ رہے تھے۔ وہ آج اژدہے کی پھنکار بن گئے تھے' طاہر

نے اسے ٹالنے کی کوشش کی تو وہ سانپ کی طرح گھوم گھوم کر حملے کرنے لگی' طاہر نے وہاں سے بھاگ نکلنا چاہا تو وہ پورے کمرے میں پھیل گئی۔ فرش سے چھت تک اور دروازے سے دیوار تک آج اسے دوٹوک جواب چاہیے تھا اور وہ بھی ایک لفظ میں' اب سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اسے ہاں کہنا ہی ہوگی ورنہ۔

طاہر کے چہرے سے کرب پسینہ بن کے ابل رہا تھا' اس کی وہی حالت تھی جو شکاری کے چاقو کے سامنے لرزہ براندام زخمی ہرن کی ہوتی ہے۔

طاہر کو پریشان دیکھ کر خالدہ کو مزہ آرہا تھا۔ وہ سخت سے سخت بات کہے جارہی تھی۔ وار پروار کیے جارہی تھی' اس بٹیری کی طرح جو اپنے حریف کو شکست کے دہانے پر دیکھ کر اسے صرف چونچ سے مارنا ہی کافی نہیں سمجھتا' پھڑک کر دولاتیں بھی جمادیتا ہے۔ خالدہ کے حملے ابھی جاری تھے کہ طاہر اچانک پرسکون ہوگیا۔ اس نے خالدہ کو ایسی خالی خالی نظروں سے دیکھا کہ وہ ڈر کر سمٹ گئی۔

تمہیں دوٹوک جواب چاہیے نا طاہر نے سوچ سوچ کر بولنا شروع کیا تو سنو تمہارے پیٹ کا آپریشن ہوا تھا نا' وہ اپنڈے سائی ٹس کا نہیں تھا' تمہارے پیٹ میں رسولیاں تھیں' خالدہ نے اسے غصے سے گھورا' اس وقت اگر اس کے ہاتھ میں لوہے کا ڈنڈا بھی ہوتا تو وہ طاہر کے سر پر دے مارتی' اس نے زبان سے لوہے کی لاٹھی کا کام لینا چاہا تو طاہر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی کہا تھا کہ رسولیاں پھر بن سکتی ہیں' میری بیوی آپریشن سے پہلے ہی مرگئی تھی بڑی تاخیر سے تشخیص ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ میں بھی رسولیاں تھیں اور اس کا بھی علاج یہ تھا کہ وہ ماں بنتی مگر میں اس کا یہ علاج نہ کرسکا۔ یہ کہتے ہوئے طاہر کا رنگ برف کی طرح سفید اور پھر انار کی طرح سرخ ہوگیا۔

خالدہ کو یوں لگا جیسے وہ کوڑھی ہے' برص زدہ ہے' گالی ہے' اس کے جسم پر چیونٹیوں کا لشکر رینگ رہا ہے۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں اور کھلے ہوئے ہونٹوں سے اس دروازے کو دیکھ رہی تھی' جس میں سے طاہر ہوا کی طرح گزر گیا تھا۔

◆◆◆

فضا میں لٹکتی ہوئی لاش

بات تو بس اتنی سی تھی کہ مجرم کو ایسی جگہ پھانسی دی جائے کہ سارا شہر دیکھے اور عبرت پکڑے مگر یہ چھوٹی سی بات اتنی بڑھ گئی کہ ایک بہت بڑی مصیبت بن گئی۔

منصف نے یہ جملہ سینکڑوں بار لکھا تھا کہ ملزم کو تادم مرگ سولی پر لٹکتے رہنے دیا جائے۔ اسے یہ جملہ اتنا ہی رسمی لگتا تھا جتنا عدالت کے صدر دروازے پر کھڑے ہوئے گن مین کے سلیوٹ کا جواب دینا۔ ابھی سلیوٹ مکمل نہیں ہوتا تھا اور اس کی کار گن مین کو پیچھے چھوڑ چکی ہوتی تھی مگر اس مرتبہ فیصلے کا آخری جملہ لکھتے وقت اس کا قلم ذرا دیر کو ٹھٹکا تھا' شاید اس لئے کہ اس نے سرکاری وکیل کی یہ استدعا بھی فیصلے میں شامل کر لی تھی کہ پھانسی ایسی جگہ دی جائے کہ ملزم کے ساتھی اس کا انجام دیکھ سکیں۔ سزائے موت سنانا ایک بات تھی اور لوگوں کو دعوت نظارہ دینا دوسری! غالباً اسی وجہ سے یہ خیال بھی اس کے دماغ میں بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ وہ عدالت کے مانوس کمرے میں نہیں بلکہ سارے شہر کے سامنے فیصلہ سنانے جا رہا ہے۔

منصف نے خلاف معمول ایک دن کی تاخیر سے فیصلہ سنا دیا۔ عدالتی فیصلوں پر عدالت کی ہدایت اور منشاء کے مطابق عمل کرنا انتظامیہ کا فرض ہوتا ہے۔ تمام فیصلے محکمہ داخلہ کا محض طواف کر کے جیل والوں کے پاس پہنچ جایا کرتے ہیں۔ انہیں اپنی ذمہ داریاں خوب معلوم ہیں لیکن تازہ فیصلہ ذرا ٹیڑھا تھا اس کی وجہ سے امن وامان برقرار رکھنے کا سوال بھی پیدا ہوا اور تماشائیوں کی نشستوں کا انتظام کرنے کا بھی اس لئے جیلر کی سرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ محض پہچان کی خاطر "پھانسی کمیٹی" کا نام ملا کمیٹی کو سب سے پہلے مناسب جگہ کا انتخاب کرنا تھا۔

شہر کا مرکزی چوک موزوں مقام تھا۔ اس کے اردگرد اونچی اونچی عمارتیں تھیں جن کی چھتوں پر محافظ دستے مقرر کئے جا سکتے تھے۔ اکثر عمارات کی دوسری منزل میں دفاتر تھے' انہیں خالی کرایا جا سکتا تھا' ان کی کھڑکیوں میں سے بندوقیں ہر زاویئے سے چاروں طرف گھوم سکتی تھیں' چوک میں بیس تیس ہزار تماشائی سما سکتے تھے۔ اس انتخاب پر شروع میں سب لوگ متفق نظر آتے تھے' انہوں نے ایک معترض کی یہ دلیل بھی مسترد کر دی تھی کہ تماشائیوں کی تعداد کم ہوئی تو پھانسی کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ دوسرے افسر نے کئی لوگوں کے منہ کی یہ بات چھین کم ہوئی تو پھانسی کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ دوسرے افسر نے کئی لوگوں کے منہ کی یہ بات چھین لی تھی کہ

تماشائیوں کی فکر نہ کیجئے' وہ گنجائش سے زیادہ ہوں گے۔ ایسے مناظر تو لوگوں کو اب فلموں میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتے اور پھر انسان کے اندر ایک درندہ بھی پنجے مار رہا ہوتا ہے اسے بھی نہ بھولیئے۔

بات وزنی تھی مگر ایک سینئر افسر کو بری لگی۔ اس نے کہا عدالت کا یہ منشاء نہیں ہے کہ انسان کے اندر کا درندہ جگایا جائے اور وحشت و بربریت کے جذبات ابھارے جائیں اس کے فیصلے سے واضح ہے کہ وہ صرف عبرت دلانا چاہتی ہے اور اندر کے درندے کو سہانا چاہتی ہے۔ آپ یہ بھی نہ بھولیئے کہ بکرے کو ذبح ہوتے دیکھ کر اونٹ ہر شے کو روندتا ہوا اس طرح بھاگتا ہے جیسے دوسری چھری اس کی گردن پر ہوگی۔ اگر اتنے بڑے ہجوم میں چند لوگ بھی خوف زدہ ہو کر بھاگے تو بھگدڑ مچ جائے گی اور تماشائی کو روند ڈالیں گے' انہیں چوک سے بھاگ نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملے گا۔

سینئر افسر کی ہاں میں ہاں ملانا تو ملازمت کے آداب میں شامل ہے اور پھر ان کی دلیل بھی صحیح تھی۔ اس سے حوصلہ پا کر تیسرے رکن نے وہ بات کہہ دی جو سب کے دل میں تھی مگر جسے زبان پر لا کر کوئی بھی نااہل اور بزدل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا زمانہ ویسے بھی نازک ہے مجرم کے چند ساتھی شہر دندناتے پھرتے ہیں' وہ ظالم اور سنگدل ہیں وہ ہجوم میں شامل ہو کر ہنگامہ بھی برپا کر سکتے ہیں اور اس ہنگامے میں ہم لوگوں کی جانیں بھی جا سکتی ہیں' اس لئے کوئی ایسی ترکیب سوچئے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

ان خیالات کی سب سے زیادہ تائید کمیٹی کے ان ارکان نے کی نہیں قاعدے کی رو سے پھانسی کی ٹکٹکی کے پاس موجود رہنا ہوتا ہے۔ سب سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کے ذہنوں میں مختلف مقامات کی تصویریں گھومیں مگر ہر جگہ انہیں قتل و خون اور بھگدڑ کے مناظر کے علاوہ اپنے لئے خطرہ بھی نظر آیا۔ ان میں سے ہر ایک نے خود ہی ایک کے بعد دوسرا مقام سنسر کر دیا کمیٹی کی کارروائی کا آغاز ہی غلط ہوا تھا۔ سب کی سوچ خوف کی پٹڑی پر چڑھ گئی تھی جو کوئی جتنا سوچتا اتنا ہی خوفزدہ ہوتا' خاموشی اتنی گہری ہوتی جا رہی تھی کہ جیلر کی کرسی چرچائی تو یوں لگا جیسے سورج کا کوئی تیر دھند کا پردہ چاک کر گیا ہے۔ جیلر کے چہرے پر سختی گھٹا بن کے چھائی ہوئی تھی' وہ اگر آدمی نہ ہوتا تو ضرور پتھر ہوتا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا بہت سی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرا کے لوٹ رہی تھیں۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا ہماری جیل بھی شہر کے وسط میں ہے۔ سب کو اچانک احساس ہوا کہ شہر تو سیلاب کی طرح جیل کے گرد گھوم کر بہت آگے نکل گیا ہے۔ اب انگریزی کی اصطلاح میں جیل تو شہر کا دل بن گئی ہے۔ جیلر کے سیاہی مائل ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ رہی تھی۔ اس نے بات بڑھائی' آپ لوگوں نے وہ کرین تو دیکھے ہوں گے جو شہر کے باہر کھڑے ہیں؟

اس بے جوڑ بات پر کئی بتیسیاں کھلیں مگر جیلر کا چہرہ کر قہقہے گلے کے نیچے ادھر ادھر کہیں چھپ گئے۔ جیل کے نوعمر افسر نے فوراً تائید کی جی جناب بعض وہ کیا کہتے ہیں خودکار' خود کفیل کمپیوٹر سے چلنے والے کرین خوب دیکھے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ آئے تھے تو ہمارے کالج میں بھی مباحثہ ہوا تھا موضوع تھا ''جدید ترین ٹیکنالوجی پر تیسری دنیا کا بھی حق ہے'' میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس مفروضے کے حق میں بولنے کو کہا گیا۔ مہمان خصوصی حزب اختلاف کے ایک لڑکے کی تقریر پر آگ بگولا ہو گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ ہمارے حکام تو ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں صرف وہی ٹیکنالوجی ملتی ہے جو ہمارے گلے کا طوق اور ہمارے حلق کی پھانس بن جاتی ہے۔ مہمان خصوصی نے مقررین کی فہرست میں اس لڑکے کے نام کے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا تھا۔ اس مباحثہ کے بعد ہم نے اس لڑکے کو کبھی نہیں دیکھا۔

خاموش رہو ورنہ تمہیں بھی کوئی نہیں دیکھے گا۔ جیلر نے مونچھیں جھاڑتے ہوئے درشتی سے کہا۔

نوجوان افسر گھبرا کر تیز تیز بولنے لگا میں تو سابق حکومت کی بات کر رہا ہوں۔ آپ سب کو یاد ہو گا۔ ان کرینوں کے بوم بجلی کو جلتے بجھتے قمقموں سے سجائے گئے تھے۔ رات کو یوں لگتا تھا جیسے وہ بھاگ کر ستاروں میں شامل ہو جائیں گے؟ اوہ کس قدر دھوکا تھا یہ سب کچھ! لوہے کے ان زرافوں کے استعمال کے لئے کوئی منصوبہ ہی نہ بن سکا۔ وہ چار سال سے پڑے زنگ کھا رہے ہیں۔

نوجوان افسر کی گفتگو سے حاضر محظوظ ہو رہے تھے۔ انہیں ذرا سانس لینے کا موقع ملا تھا مگر جیلر پہلو بدل بدل کر اپنی برہمی کا اظہار کر رہا تھا۔ آخر کمرے میں اس کی دھاڑ گونجی تم خاموش رہو گے یا تمہیں کمرے سے نکالنا پڑے گا۔ نوجوان نے اپنا سر جھکا اور خاموش ہو گیا۔ حاضرین نے جیلر کی نرم آواز سنی' یہ کرین آخر کس دن کام آئیں گے؟ ہم مجرم کو کرین پر چڑھا کر پھانسی دیں گے نیچے کی طرف نہیں اوپر کی طرف

جیلر کی پہیلی کسی کی سمجھ میں نہ آئی سب حیرت کے باوجود خاموش رہے نائب جیلر سے انتظار نہ ہو سکا' اس نے پوچھا وہ کس طرح؟ ہم کرین کی ہک سے رسہ باندھ کر مجرم کے گلے میں پھندا ڈال دیں گے۔ کرین کا بازو اوپر اٹھے گا اور گھڑچ! جیلر نے آخری جملہ یوں ادا کیا جیسے پاپڑ چبا رہا ہو۔

مگر وہ سارے شہر کو دکھانے کا حکم۔

آپ کے بال سفید ہو گئے نائب جیلر صاحب مگر وہ نہ کبھی جیل سے اوپر اٹھ سکے' نہ جیل کی دنیا سے باہر ہی نکل سکے۔ جیلر کے ہونٹ اس کی مونچھوں میں چھپ کر مسکرا رہے تھے' آپ کے سامنے تو پورا نقشہ بنانا پڑے گا۔ دیکھئے جیل کی دیوار اٹھارہ فٹ اونچی

ہے اور مجھے یاد ہے کہ کرین کا بازو ڈیڑھ سوفٹ اونچا اٹھتا ہے ملزم جیل کی دیوار سے تقریباً ایک سوتیس فٹ اونچا لٹکے گا' اتنی بلندی پر اسے کل عالم دیکھے گا۔

واہ! حاضرین میں سے کسی کے ہونٹ بے ساختہ کھلے۔ جیلر کے دیدے ان کی تلاش میں گھومے مگر اس وقت کئی ہاتھ اپنی مطمئن ''واہ واہ'' کا تعاقب کر رہے تھے۔

یہ مشکل بھی جیلر نے چٹکی بجاتے میں حل کر دی کہ فولادی زرافے کو جیل میں کیسے لایا جائے؟ جیل کی دیوار ایک جگہ سے گرا کر راستہ بنالیا جائے۔ کرین گزر جائے گا تو قیدی لگا کر اسی وقت شگاف میں اینٹیں چنوا دی جائیں' کمبخت مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں' کیا اپنی جیل کی دیوار کی مرمت بھی نہیں کر سکتے۔ جیلر نے فاتحانہ انداز میں سب کی طرف دیکھا اور ہر ایک کو متفق پایا اب کرین کو لانے اور چلانے کا مسئلہ تھا۔ کرینوں کے ساتھ ولایتی ڈرائیور اور دوسرے ماہر بھی آئے تھے۔ انہوں نے دس بارہ مقامیوں کو کرینوں کا سسٹم سمجھایا تھا اور تربیت دی تھی۔ ان کا سسٹم خاصہ پر پیچ تھا۔ انہیں چلانے والے کے لئے ضروری تھا کہ وہ الیکٹرانکس کے بارے میں بھی جانتا ہو ٹیلی سکوپس کے بارے میں بھی۔ کمپیوٹرنگ پروگرامنگ سے بھی آگاہ ہو اور ہیوی ڈیوٹی ڈرائیور بھی ہو۔ کرین کے ائر کنڈیشنڈ کیبن میں صرف ایک سیٹ تھی ایک ہی آدمی کو سارا کام کرنا تھا۔ یہ کرین بالکل نئی ایجاد تھے۔ ابھی ان کی آزمائش بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ کمپنی کے کسی افسر نے دیسی تجارتی وفد کو محض مرعوب کرنے کے لئے انہیں بھی دکھا دیا۔ وفد کے لیڈر کو یہ عجیب و غریب کرین اتنے پسند آئے کہ وہیں مچل گیا کہ انہیں بھی خریداری کی فہرست میں شامل کرو۔ ان میں نہ کوئی فولادی رسہ تھا اور نہ کوئی لیور پھر بھی ان کے بوم چاروں طرف گھومتے تھے' ڈرائیور جب چاہتا ایک ترتیب سے کبھی انہیں انگشت شہادت بنا دیتا' کبھی انہیں مکڑی کی ٹانگوں کی طرح پھیلا دیتا' کبھی ہاتھی کی سونڈ کی طرح لپیٹ لیتا اور جب بند کرتا تو وہ خوفزدہ کتے کی دم طرح غائب ہو جاتے۔ وہ ٹینک تک یوں اٹھا لیتے جیسے ماں معصوم بچے کو گود میں لے لیتی ہے۔ وفد کے لیڈر تو ان کرینوں پر فدا ہو گئے۔ اگرچہ کمپنی نے ان کی بڑی خاطر تواضع کی تھی۔ ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا تھا مگر اس نے کرین بیچنے سے انکار کیا تو وہ ناراض ہو کر وطن واپس آگئے۔ ایئرپورٹ پر ایک زوردار بیان دیا کہ نقد قیمت ادا کرنے کے باوجود ہمیں جدید ٹیکنالوجی سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ سارے ملک میں جیسے آگ لگ گئی۔ ہر طرف بحث و مباحثے ہونے لگے اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ ہمیں اب پہلی کی بجائے دوسری دنیا کی طرف دیکھنا چاہیے تلخی بڑھی تو ولایتی حکومت مجبور ہو گئی کہ دیسی حکومت سے مذاکرات کرنے کے لئے اپنا وزیر تجارت بھیجے۔ دیسی حکومت اگرچہ عوام کو کچھ ایسی گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ مگر اس معاملے میں وہ رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ یہ قوم کی ناک کا مسئلہ تھا اور اس کی

ناک کی ہڈی سابق حکمراں کی ناک کی گھوڑی کی طرح اتنی اٹھی ہوئی تھی کہ اس پر مکھی بیٹھتے ہی پھسل جاتی تھی۔ دراصل آرڈر بہت بڑا تھا۔ بہت سے ہائیڈرالک ہیمر' ایکسکے ویٹر' لوڈر' کمپریسر اور ٹریک ڈرلز سب ملا کر کروڑوں کا سامان نکل رہا تھا۔ امیر ملکوں کو بھی زرمبادلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ولایتی کمپنی کو بادل نخواستہ کرین بیچنا پڑے البتہ اس نے معاہدے میں اضافی سامان اور گھسٹوں کا ذکر ہی نہ کیا۔ ننگے بچے کرین فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ دیسی حکومت کے ماہرین کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کرینوں کے ساتھ بھی کچھ ہوتا ہے حکومت نے یہی کافی سمجھا کہ سفارتی میدان مارلیا اور قوم کا سر کرین کے بازو سے بھی زیادہ بلند کر دیا۔ کرین درآمد ہوتے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ انہوں نے بھی بوجھ اٹھانے کے کرتب دکھا کر لوگوں کا جی خوش کیا۔ پھر ان کے استعمال کے لئے منصوبے مرتب کرنے تک نہیں انہیں شہر کے باہر کھڑا کر دیا گیا۔ وہیں مقامی ڈرائیورں نے تربیت پائی مگر تربیت کی تکمیل پر کوئی تقریب نہ ہوئی۔ ولایتی ماہرین چپ چاپ واپس چلے گئے۔ مقامی ڈرائیور کچھ عرصہ کرینوں کی مزاج پرسی اور جھاڑ پونچھ کے لئے آتے رہے۔ پھر وہ بھی گھر بیٹھے تنخواہ وصول کرنے لگے۔ اس عرصے میں حکمراں کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کی جگہ دوسری ناک نے لے لی۔ اب ستواں ناک قوم کی عزت بن گئی پکڑ دھکڑ اور جواب طلبی شروع ہوئی تو کرین ڈرائیور اس خوف سے ادھر ادھر ہو گئے کہ کہیں ان سے مفت کی تنخواہ کا حساب نہ مانگ لیا جائے۔ اب کرین یاد آئے تو ان کے ڈرائیوروں کی ڈھنڈیا پڑی۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک ڈرائیور پولیس کے ہاتھ لگا۔ اس نے تو بہت ہاتھ پاؤں جوڑے مگر سپاہیوں نے ایک نہ سنی پکڑ کر پھانسی کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا۔

کمیٹی جب ڈرائیور کو لے کر موقع پر پہنچی تو وہاں چھ کے بجائے پانچ کرین پڑے تھے۔ ایک کرین شاید شرم سے زمین میں گڑ گیا تھا یا سارس بن کر اپنے ملک کو واپس سدھار گیا تھا کمیٹی کو صرف ایک کرین درکار تھا۔ اسے تعداد سے کیا غرض تھی' یہ کسی اور کا کام تھا۔ ڈرائیور نے مختلف کرین جانچے چار تو بس زمین کا بوجھ تھے۔ ایک کا پورا انجن غائب تھا۔ دوسرے کا پورا پینل دو میں سامان تو پورا معلوم ہوتا تھا مگر زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ جیلر کو اپنی تجویز طوفان میں ڈولتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا پارہ ابھی چڑھ رہا تھا کہ پانچواں کرین ایسے گڑگڑایا جیسے پہاڑ کے پیٹ میں لاوا ابلنے لگا ہو۔ کمیٹی کے ارکان الٹے قدموں پیچھے ہٹ گئے صرف ہیلر اپنی جگہ پر جما رہا۔ اس کی مونچھوں کی آڑ میں اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

پھانسی دینے کا دن مقرر ہوا تو اس کی اور اس کے ساتھ کرین کی خوب تشہیر ہوئی۔ اخبار والوں نے ہر زاویئے سے کرین کی تصویریں چھاپیں۔ ان کے آرٹسٹوں نے پھانسی کے اس انوکھے طریقے کے خیالی خاکے اور نقشے بنائے اور رپورٹروں نے انٹرویو کئے۔ ایڈیٹروں نے ان پر سنسنی خیز سرخیاں جمائیں اور نہایت مدلل مقالے لکھے۔ مقررہ دن جوں جوں قریب آیا' آس پاس کے

علاقوں سے بھی لوگ شہر میں جمع ہونے لگے۔ سارے دکانداروں کی بکری بڑھ گئی لیکن دوربینیں بیچنے والوں کی تو چاندی ہوگئی۔ انہوں نے ایک کے دس اور پھر بیس وصول کئے پھر بھی گاہک تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ دوربینوں کی خوب بلیک ہوئی۔ اخبارات میں لوگوں کے جوش و خروش اور غیر معمولی دلچسپی کے قصے پڑھ کر منصف نے سرکاری وکیل کی یہ استدعا بھی منظور کرلی کہ خون دن چڑھ جائے تو مجرم کو پھانسی دی جائے اور پھانسی دینے سے پہلے اسے کالی ٹوپی بھی نہ اوڑھائی جائے' کہیں لوگ اس شبے میں نہ پڑ جائیں کہ آدمی کی بجائے اس کا پتلا لٹکا دیا گیا ہے۔ لوگ عموماً کانوں کے کچے ہوتے ہیں اس لئے احتیاط مقدم ہے سرکاری وکیل یوں تو دور کی کوڑی لانے والا اور معاوضے کا حق ادا کرنے والا مشہور تھا مگر یہ نکتہ اس کے ذہن سے اتر گیا کہ مجرم کے پاؤں بھی نہ باندھے جائیں تاکہ تماشائی اسے ہوا میں ٹانگیں اچھالتے اور پھر ساکت ہوتے بھی دیکھیں۔

مقررہ وقت پر مکانوں کی چھتیں انسانوں سے لد گئیں۔ شہر میں کوئی اونچی جگہ ایسی نہ تھی جسے تماشائیوں نے گھیر نہ لیا ہو مجرم کے آنے سے پہلے کرین ڈرائیور خوش تھا کہ اس نے کرین کے رگرز زمین پر خوب جما دیئے ہیں۔ پینل روشن ہے اور پروگرامنگ مکمل ہے۔ اس کے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی کہ کام ختم ہوا اور وہ اس اونٹ کو چلا کر جیل سے باہر جائے مجرم کو لایا گیا تو کمیٹی کے ارکان نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور لاغر انسان تھا۔ ایسا لگتا تھا' اس کا جسم جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے مگر اس کے چہرے پر نہ تشویش کی کوئی جھلک تھی اور تفتیش کا کوئی نشان تھا۔ وہ چل کے آیا تھا' اس لئے زندہ تھا پھر بھی قانون کی تشفی کے لئے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔ مجسٹریٹ نے اس سے ایک دو سوال کئے مگر اس نے حقارت سے منہ پھیر لیا۔ مجسٹریٹ پیچھے ہٹا تو جلاد نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے اور اس کے پاؤں جوڑ کر ان کے گرد رسی لپیٹ دی۔ اس نے مجرم کا سر اور منہ ڈھانپنے کے لئے کالی ٹوپی اٹھائی تو جیلر نے اشارے سے روک دیا۔ اس نے پھانسی کا پھندا جانچا اور نظروں نظروں میں مجرم کی گردن اس طرح ناپی جس طرح مصور اپنے ماڈل کے خطوط کا جائزہ لیتا ہے۔ آخری حکم کے انتظار میں وہ پھندے کو اپنے ہاتھ پر رکھ کر تولنے لگا۔

موقع پر موجود حکام نے اپنی گھڑیاں دیکھیں' آپس میں سرگوشی کی اور جلاد کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا' مجرم کا سنسان چہرہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹھکا۔ اب تک اس نے صرف کالے ٹوپوں کو پھندے پہنائے تھے' پھندے میں جیتا جاگتا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھندا ڈال کر وہ آخری جانچ کئے بغیر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کرین ڈرائیور کو اشارہ ملا تو اس کے ہاتھ پاؤں جیسے من من بھر کے ہوگئے۔ اس نے کرینوں سے سڑک کوٹنے والے انجن تک اٹھائے تھے مگر کسی انسان کو پھانسی پر نہیں چڑھایا تھا۔ اس نے سر نیچا کر کے انگلیاں چلائیں۔ بوم ایک دو تین کر کے انگشت شہادت کی طرح اٹھ گیا۔ ڈیڑھ سو فٹ لمبی انگشت شہادت' جس کا زاویہ نوے ڈگری کے لگ

بھگ تھا۔اس نے چور نظروں سے اوپر دیکھا مگر پینل کی وارننگ لائٹ نے اس کی توجہ جذب کر لی۔اس نے کرین کے بازو کو ہلانے اور ذرا جھکانے کی کوشش کی تو سرخ بتی کے جلنے بجھنے کی رفتار تیز ہوگئی۔اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔جیل کی مختلف چھتوں پر مسلح سپاہی کھڑے تھے۔احاطوں میں بند قیدیوں کی آوازیں عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھیں۔ائر کنڈیشنڈ بند ہو گیا تھا۔اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔اس نے کئی بٹن چھیڑے مگر وہ تو سارے سبق بھول گیا تھا۔اسے یوں لگا جیسے وہ دریا کی لہریں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اس کے سامنے جیل کا دالان پانی میں ڈوب رہا تھا۔

کرین کا بازو جب جیل کی دیوار سے اوپر اٹھا تو ہر طرف ہلچل مچ گئی۔کئی لوگوں نے نعرے لگائے بعض دعائیں بڑبڑانے لگے۔کچھ منتر الاپنے لگے۔کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے سینوں پر صلیب کے نشان تان رہے تھے۔جن کے پاس دوربینیں تھیں وہ آس پاس کے لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے رواں تبصرہ کرنے لگے۔وہ مبالغے سے بھی کام لے رہے تھے۔پھر بھی ان کے پاس کہنے کو بہت کم تھا۔وہ اپنی دہرائی ہوئی باتیں ہی دہرا رہے تھے۔ایک صاحب سخت پریشان تھے۔ان کے بچے کو شاید عینک کی ضرورت تھی۔اسے کرین پر لٹکا ہوا آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا اور وہ اشارے کر کے اسے آدمی دکھانے کی اس طرح کوشش کر رہے تھے۔جیسے ہلال عید کی نشاندہی کر رہے ہوں۔لوگ شاید وہی کچھ بن جاتے ہیں جو انہیں کھلایا پلایا جاتا ہے۔

شہر میں صرف ایک جگہ ناخوشگوار واقعہ پیش آیا کسی گرہ کٹ نے تماشائیوں کی محویت سے فائدہ اٹھایا اور کئی جیبیں تراش کر رفوچکر ہو گیا۔ایک شخص نے رومال نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ بلا روک ٹوک باہر نکل گیا۔وہ چیخا میری جیب۔یہ سنتے ہی آس پاس کے سارے ہاتھ جیبوں میں اترے اور بہت سی زبانیں پکاریں' میری جیب! میں لٹ گیا! دوڑو پکڑو! جن کی جیب بچ گئی تھی۔وہ ایک طرف ہٹ گئے۔جن کی کٹ گئی تھی وہ جس طرف منہ تھا اس طرف چند قدم بھاگے۔پھر پلٹ کر اس جگہ پر آئے جہاں کھڑے تھے اور پھر دوسری جانب بھاگے۔ذرا دور سے لوگوں کو بہت سے سر ٹکراتے نظر آئے تو ان کے لئے فضا میں معلق شخص سیمنٹ کی بوری بن گیا۔

اس علاقے میں اکثر لوگ نیا تماشہ دیکھنے کے لئے بھاگے' دھکم پیل میں دو آدمی آپس میں الجھ پڑے' دو سے چار ہوئے اور چار سے بے شمار! ہنگامے اور ہائے وائے کے شور نے پولیس کو متوجہ کیا۔اس کے سپاہی گالیاں بکتے' ڈنڈے سونتے تماشائیوں کی طرف اس طرح لپکے جیسے کسان اپنے ہرے بھرے کھیتوں سے پرانے گدھے بھگانے آتا ہے۔پولیس کی کارروائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔لوگ ایک دوسرے کو بھول کر پولیس کے سپاہیوں پر پل پڑے۔افسروں نے جب دیکھا کہ اب ڈنڈے پولیس والوں کی

بجائے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں تو انہوں نے آنسو گیس کے چند گولے چلانے کا حکم دیا۔ بیشتر لوگ آنکھیں ملتے' کھانستے کھنکارتے گیس کے غبار میں سے بھاگ گئے۔ جو بھاگ نہ سکے وہ آنسو بہاتے پکڑے گئے اور جو زخمی ہو گئے' وہ ایمبولنسوں کے ذریعے ہسپتالوں میں پہنچوا دیئے گئے۔ افراتفری میں کسی نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ایک بچہ تیسری منزل سے گر کر خون میں لت پت پڑا ہے۔ اس نے چھوٹے بھائی کو گردن سے پکڑ کر اسی طرح اٹھانے کی کوشش کی تھی جس طرح کرین نے آدمی کو اٹھایا تھا چھوٹے نے تڑپ کر اپنی گردن چھڑائی اور بڑے کو دھکا دیا۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہیں تھا' اس کا پاؤں پھسلا اور وہ منڈیر کو پکڑتے پکڑتے نیچے لڑھک گیا۔ ایک نحیف سی چیخ اس کے ساتھ گئی مگر اس کے سر اور منہ سے ابلتا ہوا خون دیکھ کر وحشت زدہ ہو گئی۔

یہ تو باہر کے معاملات تھے' اصل مسئلہ تو جیل کے اندر اٹکا ہوا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر جانے کے باوجود ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر مجرم زندہ تھا نہ اس کی گردن ٹوٹی تھی اور نہ اس کا دم ہی گھٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ وقفے وقفے سے انہیں جھپک کر اپنی زندگی کا اعلان کر رہا تھا۔ دوربین سے جو افسر اس کا چہرہ دیکھتا گھبرا کر اپنی آنکھوں سے دوربین جھٹک دیتا۔ جیلر پہلے سخت حیران ہوا' پھر پریشان ہوا اور پھر قہر آلود نظروں سے بوڑھے جلاد کو جھنجھوڑنے لگا۔ کچھ وقت اور گزرا تو اس نے ساری صورتحال کا جائزہ لیا اور بھوکے بھیڑیے کی طرح جلاد پر ٹوٹ پڑا۔ تمہاری عمر گزر گئی حرام زادے پھانسی کے پھندے بناتے پھر بھی صحیح گانٹھ لگانی نہ آئی۔ دو گھونسے برسے تو بوڑھا جلاد ہاتھ جوڑ کر زرد پتے کی طرح کانپنے لگا مجسٹریٹ اور جیل کا نوجوان افسر جیلر کو بازوؤں میں تھام کر ایک طرف لے گئے۔ سمجھا بجھا کر اسے ذرا نرم کیا۔

اصل مشکل تو جوں کی توں تھی۔ مجرم کسی طرح مر ہی نہیں رہا تھا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ اسے نیچے اتار کر سیدھے پھانسی گھر لے چلو۔ مجسٹریٹ نے یہ کہہ کر پتنگ کاٹ دی کہ جیل کا سارا عملہ اور قیدی اور جیل کے باہر پورا شہر دیکھ رہا ہے۔ بات کھل گئی تو ہماری خیر نہیں کسی کو دوبارہ پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ سب نے سر اٹھا کر پھر مجرم کی طرف دیکھا۔ وہ چیل کی طرح گردن جھکائے سب کو دیکھ رہا تھا۔ سارے شہر میں شاید وہی ایک تماشائی تھا' باقی سب لوگ تماشا تھے۔

نوجوان افسر پھر جیلر کی مدد کو پہنچا' کرین ڈرائیور سے کہیئے دو چار جھٹکے دے مجرم کی گردن کا منکا ڈھلک جائے گا۔ جیلر نے پلٹ کر اسے حیرت سے دیکھا اور بھاگ کر ڈرائیونگ باکس تک اتنی تیزی سے پہنچ گیا جیسے اس کے دھڑ میں بندر کے ہاتھ پاؤں لگ گئے ہوں۔ کرین ڈرائیور کی حالت پہلے ہی غیر تھی۔ جیلر کو اچھلتے پھاندتے دیکھ کر اس کی ہتھیلیاں بھی پسینے میں ڈھل گئیں۔ جیلر نے کیبن کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ ڈرائیور نے نصف شیشہ اتارا' اس نے ڈرائیور کا کندھا تھپکا تو ایک جسم کی کپکپی دوسرے جسم میں سرایت کر گئی۔ جیلر نے

گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور ذرا سنبھل کر کہا بیٹے بس دو چار منٹ کی بات ہے تم کرین کے بازو کو دو تین جھٹکے دو اور ہمارے ساتھ چل کے دفتر میں چائے پیو۔

ڈرائیور جواب میں منمنایا کرین تو مر گیا ہے۔

جیلر نے اسے یقین دلایا کہاں بیٹے! کمبخت ابھی تک نہیں مرا۔ اس کے ذہن میں جھٹکا سا لگا۔ ڈرائیور نے تو کچھ اور کہا تھا کیا کہا؟ کرین کا بازو جام ہو گیا ہے۔ اس کا کمپیوٹر جل گیا ہے۔ اس کا انجن بیٹھ گیا ہے۔ اس کے رگرز پھنس گئے ہیں۔ اسے تو گھسیٹ کر بھی جیل سے باہر لے جانا مشکل ہے۔

کیا بک رہے ہو کچھ کرو' جیلر بنکارا۔

میں گھنٹہ بھر سے سب کچھ کر چکا ہوں کچھ نہیں ہوسکتا' ڈرائیور نے جیلر کے تیور دیکھ کر شیشہ چڑھا لیا۔

کچھ نہیں ہوسکتا کے بچے۔ جیلر نے جھٹکا دے کر دروازہ کھولا کیبن اتنا چھوٹا تھا کہ تھپڑ بھی نہیں مارا جاسکتا تھا صرف دانتوں سے کاٹا جاسکتا تھا۔ جیلر دانت بچا بچا کر کیبن میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے دوسرا دروازہ کھولا اور دہشت زدہ ہرن کی طرح چھلانگ لگا دی۔ کیبن کے دونوں دروازے بند ہو گئے۔ ڈرائیور نے دیکھا کہ جیلر انہیں کھولنے کے لئے ناب سے لڑ رہا ہے۔ اس نے نیچے کھڑے ہوئے افسروں کو سلام کر کے کہا ابھی بلا کے لاتا ہوں اور بھاگتا ہوا ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ سارے افسر کیبن میں محبوس جیلر کی حرکتیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور کو صرف اترتے ہوئے دیکھا تھا۔

جیلر نے بڑی جدوجہد کے بعد دروازہ کھولا کیبن میں تو اس کی سانس ہی بند ہو چلی تھی وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ یہ چند لمحے اس کے چہرے پر برسوں کی راکھ جھاڑ گئے تھ۔ کرین مر گیا ہے! اس کی آواز اس کے حلق میں جم گئی تھی۔

سب کو حقیقت معلوم ہوئی تو وہ جیلر کے دفتر میں جمع ہوئے سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ایکا ایکی نا سمجھ ہو گئے تھے۔ صرف نائب جیلر کچھ ایسا پریشان نہیں تھا اس نے خاموشی سے اکتا کر بات چھیڑی۔ جب کرین کا بازو اٹھ رہا تھا تو مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ نہ پھندا ٹھیک لگا ہے اور نہ گانٹھ' تختہ کھلتے ہی جب مجرم پھانسی گھر میں گرتے ہیں تو چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح تڑپتے پھڑکتے اور الٹتے پلٹتے ہیں وہ تو اس طرح سکون سے اوپر چڑھ گیا تھا جیسے معائنہ کرنے جا رہا ہو۔ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار انسان دیکھے ہوں۔

ممکن ہے زمین پر ہی دہشت سے مر گیا ہو۔ نوجوان افسر نے جیلر کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

وہ کمبخت تو اس وقت بھی زندہ ہے۔ کھڑکی میں سے جھانک کے دیکھ لونا۔ نائب جیلر نے اطمینان سے جیلر کے سر پر ٹھنڈے پانی کی ایک اور بالٹی انڈیل دی۔

ایک ترکیب ہے کیوں نہ اسے گولی ماردی جائے۔ نوجوان افسر کو رہ رہ کر جیلر پر ترس آرہا تھا۔

اسے گولی مار دیا توپ سے اڑادو۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ مجرم کو لوہے کی اس لاٹھ سے نیچے کیسے اتارا جائے؟ نائب جیلر کی گفتگو بڑی ہموار تھی۔

سب ان دونوں کی باتیں سن بھی رہے تھے اور نہیں بھی سن رہے تھے۔

اس وقت اگر آندھی آجائے تو مجرم کو دو چار جھٹکے لگیں گے اور وہ جھول کر ہی مرجائے گا۔ سب نے نوجوان افسر کی خواہش کی تلاش میں کھڑکی سے باہر دیکھا' افق چمک رہا تھا' گرد کا کہیں نشان نہیں تھا۔ ہوا مزے سے ٹہل رہی تھی مجرم سے کچھ فاصلے پر چند پرندے ہوا میں تیر رہے تھے۔ وہ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ آدمی ان کے محفوظ علاقے میں کیسے پہنچ گیا؟ اتنی دیر کھڑا کیا کر رہا ہے؟ وہ اتنا بے ضرر کیوں ہے؟ وہ اس میں بھی کوئی دھوکہ دیکھتے تھے۔ دور ہی سے پر مار کر رخ بدل لیتے تھے۔ مختلف احاطوں میں بند قیدیوں کے نعرے بلند ہوتے جارہے تھے۔ لاش کو نیچے اتارو۔ کرین کا سایہ گھٹ کر کھلونا بن گیا تھا۔

اگر ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ مجرم دو ڈھائی گھنٹے سے ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر گلے میں پھندا ڈالے زندہ ہے تو اسے ایک کرامت سمجھیں گے اور مجرم کو پیر فقیر مان لیں گے پھر ہم لوگوں کی خیر نہیں۔ نائب جیلر نے خاموش کمرے میں ایک اور شوشہ چھوڑا۔ اس مرتبہ صرف جیلر نے اسے زخمی کبوتر کی نظروں سے نہیں دیکھا' کئی غراتی ہوئی آنکھیں بھی اس پر حملہ آور ہوئیں اور وہ کرسی کے بازوؤں میں سمٹ گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو کمرے میں افسریوں اچھلے جیسے کرین چل پڑا ہو۔ ان کے اندر کے سارے سپرنگ ایک ساتھ کھل گئے۔ جواب کا انتظار کئے بغیر سرکاری وکیل اپنے نائب کے ساتھ ہوا کا جھونکا لے کر اندر داخل ہوا۔ اس کی خاطر ساری کرسیاں خالی ہوگئیں۔ وہ اپنی پریشانی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ لوگ بھی عجیب ہیں تھوڑی دیر پہلے جس آدمی کے سولی پر لٹکنے کا تماشا دیکھ رہے تھے اب اس کی لاش کی عزت کے نام پر بپھر رہے ہیں۔ کہتے ہیں لاش خدا اور زمین کی امانت ہوتی ہے اسے اتارو جیل سے دو تین فرلانگ پر بھی دو چار سو آدمی دمع ہیں۔ پولیس نے انہیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی کوٹ اتار کر نیچے ڈال دیا تھا۔ بھائی کیا خبر وہ کالا گاؤن دیکھ کر مجھے منصف سمجھ لیتے اور پتھر مارتے! وکیل نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اپنا ذہن ہلکا کر لیا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا تمام کرسیوں کی گود خالی تھی۔ حاضرین کرین کے بازو کی طرح اکڑے کھڑے تھے۔ اس نے کہا آپ لوگ بیٹھتے کیوں نہیں؟ سب نے بڑھ کر کرسیاں یوں پکڑیں جیسے ابھی بھاگ کھڑی ہوں گی۔ سرکاری وکیل کو جانے پہچانے چہرے اجنبی سے لگ رہے تھے۔

وزیر داخلہ اور دوسرے تمام افسر اور منصف صاحب آپ لوگوں سے بہت خوش ہیں۔ سرکاری وکیل نے کمرے کا ماحول تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجھے آپ سب کو مبارکباد کہنے کو بھیجا ہے' ساتھ ہی حکم دیا ہے کہ اب لاش اتار لی جائے۔

جیلر تو اندر ہی اندر پگھلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کبھی وزیر داخلہ کا چہرہ اور اس میں جڑی ہوئی پتھر کی آنکھیں گھومتیں اور کبھی فرغل میں لپٹے ہوئے منصف کا ڈراؤنا ہیولا! کبھی دونوں تصویریں آپس میں گڈمڈ ہو جاتیں کہ ایک کے چار ہاتھ لگتے' جو اسے گرفت میں لینے کے لئے پھیل رہے تھے۔ دوسرے افسروں کے حلق بھی خشک اور زبانیں اکڑ گئی تھیں۔ سرکاری وکیل نے سب کی صورتوں کا بغور مطالعہ کیا۔ آپ لوگ بھی شاید یہ انوکھی پھانسی دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ سرکاری وکیل کا گلا اب صاف ہو چکا تھا۔ واقعی ڈراؤنا منظر تھا! سنا ہے بے شمار عورتیں چیخیں مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ کئی کمزور دل مرد بھی زرد پڑ کے گر گئے۔ ہم نے پہلے ہی سے شہر بھر میں ایمبولینس پھیلا دی تھیں۔ ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ یہ لوگ ڈنڈے کے مرید ہیں اسی طرح ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ اب کچھ روز آرام رہے گا آپ لاش اتارنے کا حکم دیں۔

نوجوان افسر نے ذرا سی جرات دکھائی اور ہکلاتے ہوئے کہا۔ وہ لاش نہیں ہے۔ مجرم ابھی زندہ ہے۔

کیا عجیب بات کرتے ہو؟ ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا ہے؟

ڈاکٹر کو مجرم تک کیسے پہنچایا جائے؟

لاش کو نیچے اتار کر۔

مگر کرین تو مر گیا ہے۔ اس کا بازو جام ہو گیا ہے۔

ڈرائیور کو بلاؤ۔

وہ بھاگ گیا ہے۔

جیل سے بھاگ گیا ہے؟

وہ کسی باہر کو بلانے کے بہانے چلا گیا۔

تم نے کسی ولایتی ماہر کا پتہ چلایا؟

وہ سب شیطان تو پہلے ہی فرار ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کیا کوڑا کرٹ بیچتے رہے ہیں۔ دیکھتے تا ان کا جدید ترین ایک مریل سے آدمی کو پھانسی دینے کے کام بھی نہیں آسکتا۔

سرکاری وکیل کو اچانک اندازہ ہو کر معاملہ کس قدر نازک ہے۔ پھر یہ لاش کب تک فضا میں جھنڈا بنی رہے گی؟ کچھ سوچو! سوچتے سوچتے ہمارے دماغ تو ماؤف ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے سب کچھ غلط تھا سب کچھ غلط ہو گیا' نوجوان افسر خود ہی اپنے سینئر افسروں کا ترجمان بن گیا۔

سرکاری وکیل کا چہرہ سرخ ہو گیا اسے حسب ضرورت اپنے چہرے کا رنگ اور اپنے تیور تبدیل کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ مجھے تو یہ سب سازش معلوم ہوتی ہے تم لوگ یا تم میں سے کچھ لوگ مجرموں کے ساتھی معلوم ہوتے ہو ورنہ ایسی حرکت نہیں ہو سکتی تھی' اس نے سانپ کی طرح اچھل کر وار کیا۔ سب نے تھوڑی دیر کو یوں محسوس کیا جیسے ان کے جسم نیلے پڑ گئے ہیں۔

کرین ہم نے تو نہیں بنائی۔ جیلر کا ساؤنڈ باکس بھی پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ نوجوان افسر کو اس کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ وہ چمک کر بولا۔ کرین سے پھانسی دینے اور جیل کے قواعد بدلنے کی اجازت تو آپ نے لے کر دی ہے جناب! آپ بھی اس سازش میں شریک ہیں۔

بکومت' ایک چھوکرے کا یوں منہ آنا سرکاری وکیل کو بہت برا لگا تم ہو کیا چیز؟ میں بھی اس جیل کا افسر ہوں مگر جونیئر سا! اور دوسروں کی طرح اس سازش میں شریک ہوں۔

سب کو نوجوان افسر کی جرات پر رشک آرہا تھا۔ ان کے اعصاب ڈھیلے پڑتے جارہے تھے۔ انکی ذمہ داری بٹتی جارہی تھی۔ اب وہ تنہا مصیبت میں مبتلا نہیں تھے سرکاری وکیل نے نوجوان افسر کو گھورا مگر جب اس نے آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں تو وکیل نے طرح دے جانا ہی مناسب جانا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا کھڑکی اور سورج کے درمیان کرین کی سونڈ تھی اور اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا مقناطیسی آدمی

سورج کی تیز کرنیں اس کی آنکھیں چیرنے لگیں تو اس کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ بند آنکھوں میں رنگوں کا غبار بھر گیا۔ اس میں افق تا افق رنگ برنگے کرین بازو اٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ایک آدمی چپکا ہوا تھا جو آہستہ آہستہ کھل کر جھنڈا بنتا جارہا تھا' جھنڈوں کی قطار لمبی ہوتی جارہی تھی۔ وہ ہلکی ہوا میں سرسرانے لگ گئے تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ نہیں

ہوسکتا۔اس نے پہلی بار کوئی جملہ بلاسوچے سمجھے کہا اور گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔سورج کی کرنوں نے پھر وار کیا تو اس نے منہ پھیر کر کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیئے۔

کچھ کرو' کچھ سوچو' حکومت تو بعد میں کوئی کارروائی کرے گی۔لوگ لاش کی عزت کی خاطر پہلے ہی ہماری تکہ بوٹی کر دیں گے۔ سن نہیں رہے؟ ہجوم کے نعروں میں نئی نئی آوازیں تیزی سے شامل ہو رہی ہیں قیدی بھی جنگلے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔جلدی کچھ کرو۔سرکاری وکیل کی آواز میں اب التجا تھی۔

ہم تو سب کچھ کر چکے' آپ ہی بتایئے' بڑی دیر بعد جیلر کی صاف آواز سنائی دی شاید اسے سرکاری وکیل بھی اب اپنا قیدی معلوم ہو رہا تھا۔

کرین کا بازو کاٹ دو۔سرکاری وکیل کے چہرے پر ذرا سی رونق آئی۔

مگر اس میں تو وقت لگے گا۔حاضرین کا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔

میں ایک گھنٹے کی مہلت لے دوں گا۔

مگر کرین بازو تو منوں وزنی ہے۔وہ کٹے گا تو قیدیوں کے احاطے اور جیل کی دیواریں توڑ ڈالے گا۔نوجوان افسر نے سوچتے ہوئے کہا۔

ٹوٹنے دو۔

کئی قیدی مر جائیں گے' بہت سے فرار ہو جائیں گے۔جیلر نے تشویش ظاہر کی۔

''مرنے دو' فرار ہونے دو۔''

کرین کا بازو نہ کٹا تو؟

پورا کرین توڑ دو' سارا جیل ڈھا دو' مگر یہ جھنڈا گراؤ' سن لیا تم نے' یہ کہتے ہوئے سرکاری' وکیل کرسی سے ٹکرایا' کرسی لڑھک گئی۔ اس کے نائب نے ٹھوکر سے کرسی ہٹائی اور دروازہ کھولا۔وہ سب کو حیرت میں ڈوبتا چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

◆◆◆

رات کی روشنی

''ہاتھ ٹوٹیں لنگڑے کے میری بیٹی کو دھن کے رکھ دیا ہے۔'' ماں نے گرم دودھ میں انڈہ پھینٹتے ہوئے کہا کلہاڑی لگے تو ایک گھاؤ ہوگا دکھائی دے گا پر یہ بھیتری مار اللہ بچائے اس سے انگ انگ پھوڑا بن جاتا ہے ایک بھی زخم نظر نہیں آتا تم تو جانتی ہو بیٹی بڑی مار کھائی ہے میں نے تمہارے باپ کے ہاتھ سے لیکن بیٹی تم نے بھی تو حد کر دی جانتی تو ہو اپنے باپ کی تیز طبیعت کو۔ بیٹی کو کروٹ بدل کر کراہی تو ماں نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ لو پی لو اسے اندر کے سارے درد چن لے گا۔

انڈہ دودھ تو بہت گرم نہیں ہوتا ماں؟ بیٹی نے گلاس اپنے ہونٹوں کے پاس روک لیا۔

تمہیں گرمی کیا کہتی ہے بیٹی؟ ماں مسکرائی تو بیٹی نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ ماں نے بیٹی کی پیٹھ سہلائی نیل ڈال دیئے ہیں بے درد نے میری بیٹی کے مکھن ایسے بدن پر بیٹی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہ آئی غیرت دار کو ماں اپنے شوہر کو اتنے پیار سے کوس رہی تھی کہ کوسنے بھی مسکرا رہے تھے۔

بیٹی تم ذرا اپنی قمیض اتارو میں گدی سے سینکتی ہوں تمہارا جسم۔ بیٹی شرم سے دوہری ہوگئی ماں نے اسے ننگا دیکھا ہوگا کبھی دس بارہ سال پہلے مگر اب تو ماں اس کی طرف پیٹھ کیے کھیس کی گدی لگا رہی تھی۔

وہ مہرو مسلی کی سب سے بڑی بیٹی تھی چار بہنیں اور دو بھائی اور تھے مہرو کے دو بچے مر گئے تھے ورنہ اب دو بیٹے اور سات بیٹیاں اسے ابا کہہ کر پکارتیں بچوں کی تعداد شاید اس سے بھی زیادہ ہوتی مگر مسلن دور اندیش تھی سردیوں میں اپنے بچوں کو ضامن بنا لیتی تھی۔ اس کے اور مہرو کے بستر کے درمیان پہلے دو پھر تین اور پھر چار بچے پہاڑ بن گئے تھے مہرو ابھی تک اسی پلنگ پر سوتا تھا جو مسلن جہیز میں لائی تھی اس کے پائے بدرنگ اور چولیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں اور نواڑ میں اتنی گانٹھیں سل چکی تھیں کہ وہ موٹے کھرے بان کی طرح کاٹتی تھی۔ پھر بھی مہرو کو اسی پر اچھی نیند آتی تھی۔ مسلن کے ماموں نے ایک چترنگی پیڑھا بھی دیا تھا جس کی پشت پر چھوٹے چھوٹے آئینے جڑے ہوئے تھے۔ بچوں نے کھیل کھیل کر آئینے باندھے کر دیئے تھے۔ ان میں سے ایک آدھ ہی آنکھ مار رہا تھا مگر مسلن اسے روز جھاڑ پھونک کر اتنے شوق سے چکی کے ساتھ سجا دیتی تھی جیسے ابھی ابھی ترکھان کی دکان سے آیا ہے۔ کبھی چکی کی ہتھی بھی رنگین ہوگی لیکن اب تو اس مسلن کی انگلیوں کے نشان ہی کندہ تھے۔

براہوگرمیوں کا' کوئی احتیاط کام نہ آتی تھی' مہرو جب نمبردار کی بیٹھک سے لوٹتا تھا تو مسلن کی ساری خماتیں غافل پڑی سو رہی ہوتی تھیں۔ پہلے دو بچوں کے سوا مہرو کے سارے بچے سردیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ مرنے والی دو بچیوں میں سے ایک کا انتقال نمونیئے سے ہوا تھا' دوسری کو بھی شاید سردی ہی لگ گئی تھی۔

اللہ کی کروڑوں میل پھیلی ہوئی زمین پر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھڑی مہرو اور اس کے کنبے کا گھر تھی۔ کوٹھڑی کے سامنے دالان بھی تھا مگر اتنا چھوٹا کہ سوکھے کیکر کی چھاؤں بھی دن میں دو بار اسے پھلانگ جاتی تھی۔ سردیوں میں مہرو کے بچے چٹائیوں پر کیڑوں کی طرح کلبلاتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں انہیں کھاٹیں تو مل جاتی تھیں مگر دو لڑکیوں کو ایک ایک کھاٹ پر سمٹ کر سونا پڑتا تھا۔ مہرو دو تین کھاٹیں اور بن لیتا مگر انہیں بچھاتا کہاں؟ دالان کے ارد گرد کمر تک اونچی ایک کچی دیوار تھی جو مہرو کی ملکیت کی نشاندہی کرتی تھی' سارے کنبے کو اسی کے اندر سمانا تھا۔ یہ دیوار مانگے تانگے کے گوبر سے تھوپے ہوئے اوپلوں کو سکھانے کے کام بھی آتی تھی۔ دور سے ایسا لگتا تھا کہ دیوار کے کالی چیچک نکل آئی ہے لیکن یہ کوئی عجیب منظر نہیں تھا۔ گاؤں کی بہت سی کچی دیواریں ہر وقت اوپلوں کا رس چوستی رہتی تھیں۔

مہرو کو مسلی کہلانے سے نفرت تھی مگر اپنی مرضی سے ماں باپ اور ذات گوت تو منتخب نہیں کی جا سکتی' مسلی کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے مسلی کہلاتا تھا البتہ کام اس نے سارے کسانوں والے اختیار کئے تھے کبھی کبھار جب اسے شادی غمی کا پیام پہنچانے کے لئے کسی دوسرے گاؤں جانا پڑتا تھا تو اس وقت وہ اپنے آپ کو بھی مسلی لگتا تھا۔ راستے بھر کڑھتا رہتا تھا مگر ایسی بیگار سے انکار کرتا تو کھاتا کہاں ہے؟ زمیندار ناراض ہو جاتے تو اسے کھیتوں میں کام نہ ملتا اور کھیت تو اس کی زندگی تھے۔ ان کی مٹی کو وہ ہاتھوں میں رگڑ کر اس طرح سونگھتا تھا جیسے وہ عطر اور پھلیل میں بسی ہوئی ہو۔ اس کا زیادہ وقت کھیتوں میں گزرتا تھا۔ کبھی فصلوں کی رکھوالی کرنے میں اور کبھی کٹائی اور چنائی کرنے میں۔ گڑ بنانے میں تو اس کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ گڑ تو وہ ہے جو گنے کے خالص رس سے بنایا جائے۔ رنگ کاٹ اور سوڈے کی ملاوٹ تو گڑ کا مزہ بگاڑ دیتی ہے۔ ایسا گڑ اب وہی بنا سکتا تھا کو ملاوٹ سے پاک ہو۔ اس لئے گاؤں کا گڑ اس کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

ایک عرصے تک مہرو کے دل میں یہ خواہش مچلتی رہی تھی کہ وہ بھی مزارع بنے' اس کا نام بھی پٹواری اپنی کھتونی میں لکھے اور وہ بھی دو بیل پالے جو گجر دم گھنٹیاں بجاتے ہوئے کھیتوں کو جائیں مگر گاؤں کے زمیندار دانا تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ نائی میراثی اور مسلی اگر مزارع بن گئے تو ان کے حصے کا کام کون کرے گا؟ کچھ تو لوگ مٹھی چپی اور خدمت کرنے کے لئے بھی درکار ہوتے ہیں۔ انہوں نے

مہرو کی ڈری سہمی درخواست ہنسی میں اڑادی تھی۔کوئی ایک بھی اسے اپنی زمین کی ایک کترن دینے کو تیار نہیں ہوا تھا جس میں ہل جوت کر وہ خوش ہولیتا' پھر بھی تلائی اور بجائی کے وقت وہ کھیتوں میں گھومتا رہتا مزارعوں کی مفت میں مشورے دیتا اور موقعہ ملتا تو خوشی خوشی ان کا ہاتھ بھی بٹادیتا جوں جوں فصل بڑھتی جاتی' اس کا دل بھی بڑا ہوتا رہتا۔کٹائی کے وقت وہ اپنی کمر میں پٹکہ باندھ کر اور اپنی درانتی خوب چمکا کر سب سے پہلے کھیت میں پہنچ جاتا۔فصل اٹھتی تو اسے سات آٹھ ماہ کے کھانے کی گندم مل جاتی' باقی دنوں کے لئے باجرہ اور مکئی آجاتی۔کماد کی کٹائی اور گڑ بنانے کے عوض اسے دس گیارہ من گڑ بھی مل جاتا' لسی اور ساگ پات تو مفت ہی تھا۔باقی اخراجات وہ کپاس کی فصل کی چنائی اور ڈھوائی کر کے پورے کرلیتا۔ہر سال گاؤں میں ایک آدھ شادی بھی ہوجاتی تھی۔اس موقع پر اس کی خدمت بلکہ اس کے باپ دادا کی عمروں کی بیگار بھی کام آتی تھی اسے کچھ نقد اور کپڑوں کا ایک جوڑا مل جاتا تھا۔

گاؤں کے خواص میں کوئی بڑا زمیندار نہیں تھا جہاں کوئی بڑا نہیں ہوتا' وہاں چھوٹے بڑے بن جاتے ہیں سب زمیندار گھرانے چار پانچ پانچ مربعوں کے مالک تھے۔ان میں بھی ایک ایک مربع گھوڑی پال تھا جو کسی وقت بھی منسوخ ہوسکتا تھا۔نمبردار کو آدھا مربع نمبرداری کے نام پر زندہ ملا ہوا تھا۔وہ بھی نمبرداری تک تھا۔یہ اضافی تکیل انگریزوں کے وقت سے چلی آرہی تھی۔انگریز تو چلے گئے تھے لیکن سرکار تو یہیں چھوڑ گئے تھے۔یہ گاؤں نہر کی دم پر واقع تھا۔سرکار خیال نہ رکھتی تو اسے پانی کی ایک بوند نہ ملتی۔راستے میں بڑی بڑی زمینداریاں پڑتی تھیں ان کے مزارع نہر کاٹ کر اپنے مالکوں کے کھیت تالاب بنالیتے' پھر اس گاؤں کے لوگ کیا کرتے فصلیں کیسے اگتیں اور زمینداریاں کیونکر چلتیں؟ اس لئے گاؤں کے سارے زمیندار سرکار کے بے دام غلام تھے۔اسے خوش رکھنے کے لئے سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔نمبردار تو صرف اس لئے تھا کہ ہر گاؤں میں ہوتا ہے اور چک بندی کے وقت اس کے نام کا بھی آدھا مربع رکھا جاتا ہے۔

ہر زمیندار کی اپنی اپنی بیٹھک تھی مگر مہرو سب کا مشترکہ مسلی تھا۔وہ سب کو تھوڑا تھوڑا وقت دیتا تھا۔نمبردار کی بیٹھک میں اس لئے زیادہ دیر رہتا تھا کہ اس کے گھر میں چلا بڑھا تھا اور اس کی بیٹھک میں بیٹری سے چلنے والا ریڈیو بھی تھا۔کسی وقت علی بخش ظہور اور زاہدہ پروین کی کافیاں' کسی وقت خبریں اور کسی وقت سائیں مرنا کا اک تارا تھا' جسے سن کر مہرو کا رواں رواں مست ہوجاتا تھا۔

مہرو کو بس اتنا یاد تھا کہ جس سال لاٹ صاحب کی سواری ضلع سے گزری تھی' اس کا باپ اسے اوپر کے کام کرنے کے لئے نمبردار کے گھر چھوڑ آیا تھا اور جب اسکی آواز پھٹنے لگی تھی تو نمبردار کے گھر میں اس سے پردہ ہوگیا تھا ہونا بھی چاہیے تھا۔نمبردار کی بڑی بیٹی اسے خواہ مخواہ اچھی لگنے لگی تھی۔وہ بھی اچانک اس پر مہربان ہوگئی تھی۔اسے پیار سے بلاتی تھی اور گھر والوں کی نظریں بچا کر اسے

پراٹھا یا کھیر کا پیالہ دے دیا کرتی تھی۔ تھا تو وہ مسلی مگر صورت اچھی خاصی تھی اور صورت سے بھی کیا ہوتا ہے؟ وہی تو ایک نوعمر لڑکا تھا جس سے نمبردار کی بیٹی تھوڑی دیر ہنس بول بھی لیتی تھی اور شرمانے اور اٹھلانے کا لطف بھی اٹھا سکتی تھی۔ پھول تو وہی منتخب کیا جاتا ہے جو نظر آتا ہو اور جس تک ہاتھ پہنچ سکتا ہو سب کے رانجھے تخت ہزارہ چھوڑ کر نہیں آتے' انہیں اپنے آس پاس ہی کوئی رانجھا بنانا پڑتا ہے۔ کالے پانی (انڈیان) میں پیدا ہونے والی کیسی ہی حور پری کی ہوا سے کالے پانی کا آدمی ملے گا جوڑ غلط ہو سکتا ہے بلکہ اکثر جوڑ غلط ہوتے ہیں پھر گھس پٹ کر چھپ جاتے ہیں غلط سلائی کا ہلکا نشان باقی رہ جاتا ہے پر اسے دیکھنے کی فرصت کسے ہوتی ہے؟

مہرو اور نمبردار کی بیٹی کے درمیان تو ایسی ویسی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی کہ سامنے پر وہ گر گیا تھا۔ پر وہ نہ بھی تو ہوتا تو جوڑ اتنا غلط تھا کہ چند روز میں نمبردار کی بیٹی کا جی بھر جاتا اور وہ اسے ٹوٹے ہوئے برتن کی طرح اٹھا کر کوڑے میں پھینک دیتی' مہرو اس حادثے سے تو بچ گیا تھا لیکن اس کی ٹانگ نمبردار کے گھر میں ٹوٹ گئی تھی' اسے شہر کے ہسپتال میں لے جایا جاتا تو نرم ہڈی تھی' ٹھیک سے جڑ جاتی نمبردار کا تانگہ گھوڑا ابھی موجود تھا مگر اس روز نمبردار کو شہر میں کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے گاؤں کے سیانے کو بلا کر اس کی ٹانگ بندھوا دی تھی' پٹی کھلی تھی تو وہ بگلے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا رہ گیا تھا' دوسرا پاؤں زمین پر رکھنے کے لئے اسے جھکنا پڑا تھا۔ نمبردار کی طرف سے پھر بھی اس کا دل صاف تھا صرف گاؤں کے سیانے کی جان کو آ گیا تھا۔ جب تک وہ جیتا رہا تھا۔ یہ اسے بھنڈ قاہی کہتا رہا تھا۔ نمبردار سے وہ اس لئے بھی خوش تھا کہ اس نے اپنے احاطے کا ایک حصہ اسے بخش دیا تھا باقاعدہ لکھا پڑھی تو نہیں ہوئی تھی مگر سارا گاؤں جانتا تھا کہ دالان سمیت یہ کوٹھڑی مہرو کی ملکیت ہے۔

نمبردار کے بعد مہرو گاؤں کے مولوی صاحب کا پکا مرید تھا۔ ان کا کام ہوتا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب اسے معاوضے میں کیا دے سکتے تھے۔ وہ خود ہر وقت زمینداروں کی فصل کے لئے دست دعا بنے رہتے تھے کہ انہیں فصل کے مطابق ہی فصلہ نہ ملتا تھا' وہ مہرو کو بس مسئلے مسائل سنا دیتے تھے' نماز پڑھنے کی تلقین کرتے تھے اور کبھی زیادہ خوش ہوتے تو دعا بھی دے دیا کرتے تھے۔ مہرو مفت میں ان کی خدمت کرتا تھا۔ اس لئے ان سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب اسے پیار سے سمجھایا کرتے تھے کہ دین کے معاملوں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ انہیں مہرو کی کمزوری معلوم تھی۔ وہ کہتے تھے زیر زبر بھی الٹ پلٹ جائے تو نقدی یا اجناس کی شکل میں کفارہ دینا پڑتا ہے۔ کفارے کا لفظ مہرو کی زبان پر قفل بن کے لگ جاتا تھا۔ پانچ سات دن تک وہ کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کرتا تھا۔ ایک روز تو مولوی صاحب بہت ناراض ہو گئے تھ۔ مہرو نے بقرعید سے پہلے سجے ہوئے دنبوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ مولوی صاحب ان دنبوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ عید کے دن نورا قصائی ان کے ساتھ کیا سلوک

کرے گا تو یہ آج سے ہی کھانا پینا چھوڑ دیں۔ بھوک ہڑتال کر دیں' مولوی صاحب کا ہلدی ایسا رنگ غصے سے لال ہو گیا تھا۔ انہوں نے گرج کر کہا تھا۔ یہ براق ہیں ان کے بارے میں آئندہ ایسی کوئی بات منہ سے نکالی تو تمہارے خلاف فتویٰ دے دوں گا اور تمہارا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ اس دھمکی سے مہرو ڈر گیا تھا' بات بھی ڈرنے کی تھی جو آدمی نکاح باندھ سکتا ہے وہ نکاح توڑ بھی سکتا ہے۔ مہرو نے کان پکڑ کر توبہ کی تھی اس روز اسے معلوم ہوا تھا کہ اندر سے مولوی صاحب بڑے قہر کے آدمی ہیں۔ وہ شاید ان سے مرعوب ہی رہتا مگر عید کی سہ پہر کو حجرے کے سامنے کھالوں کی ڈھیری دیکھ کر وہ مسکرا دیا تھا۔ اسے مولوی صاحب بالکل بچے لگے تھے کبھی بکرے کی کھال اوڑھے ہوئے اور کبھی دنبے کی! پھر بھی وہ مولوی صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا' اسے یقین تھا کہ مولوی صاحب کی دعاؤں کی بدولت اسے دو بیٹے ملے ہیں' ورنہ مسلن نے تو بیٹیوں کی قطار باندھ دی تھی۔ مولوی صاحب کی یہ بات بھی اس کے دل کو لگتی تھی کہ جو بچہ دنیا میں آتا ہے' اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔ دینے والا پتھر میں بھی کیڑے کو خوراک پہنچاتا ہے۔

جب پانچ بچے ہو گئے تو مہرو کی محنت ان کا پیٹ بھرنے کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگی۔ مسلن کی بھی آنکھیں تھیں' وہ دیکھ رہی تھی کہ مہرو کتنا بھی دوڑا بھاگا پھرے نہ سات پیٹ بھرنے کے لئے اناج لا سکتا ہے اور نہ سات تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا۔ مہرو نے سہاگ رات میں اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کبھی کسی گھر کی ٹوکری نہیں اٹھائے گی مگر ایک دن اناج کے خالی کنستر دیکھ کر اس نے وعدہ توڑ دیا تھا۔ وہ ایک زمیندار کے گھر کا کوڑا کرکٹ سمیٹ کر گھورے پر پھینک آئی تھی۔ مہرو نے منہ ضرور بنایا تھا مگر منہ سے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ بس گائے کی طرح ایک دو بار سر جھٹک کر گلے میں یہ پڑ ڈلوا لیا تھا۔ مسلن ایک کی بجائے دو گھروں کا کوڑا اٹھانے لگی تھی تو اس سے مہرو کی محبت اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے خوش ہو کر کہا تھا مولا نے کام کرنے کے لئے ہاتھ دیئے ہیں' اگر دو کی بجائے چار ہاتھ کام کرنے لگیں تو مولبی صاحب کہتے ہیں کہ گھر میں برکت بڑھ جاتی ہے۔ یہ برکت باسی روٹیوں اور پھٹے پرانے کپڑوں کی شکل میں مہرو کے گھر پہنچنے لگی تھی۔

مہرو جتنا شیریں زبان تھا۔ اتنا ہی غیرت دار بھی تھا۔ وہ چٹکلوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتا تھا' سب کو ہنساتا تھا اور اپنے آپ پر بھی ہنستا تھا لیکن مذاق میں بھی اگر کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے مہرو کی عزت پر حرف آتا ہو تو وہ بھنائی ہوئی بھڑ کی طرح کاٹ کھاتا تھا۔ ایک زمیندار نے اسے چھیڑنے کے لئے پوچھ لیا تھا۔ مہرو یہ تو بتاؤ تمہارا رنگ سانولا ہے اور مسلن کا رنگ بھی کچھ ایسا صاف نہیں ہے۔ پھر تمہاری اولاد انگریزوں کی طرح گوری چٹی کیسے نکلی ہے؟ اس سوال پر حاضرین ایسی خبیث ہنسی ہنسے تھے کہ مہرو کا سر سن ہو گیا تھا' وہ تھوڑی دیر خاموش رہا تھا پھر اس کے حلق سے کانپتی ہوئی آواز نکلی تھی۔ مدتیج یہ سب مولا کے رنگ ہیں۔ آپ پٹھان ہیں اور آپ

کی سات پشتوں میں کوئی بچہ کالا رنگ لے کر پیدا نہیں ہوا مگر آپ کے دونوں صاحبزادے مولا انہیں میری عمر بھی دے دے' پکے رنگ کے ہیں' گلی میں نکلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے' تختی پر کالے حرف چل رہے ہیں۔ شجرے تو سب صحیح ہیں مدیح پر کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ مسلیوں کی اولاد گوری نکل آتی ہے اور پٹھان بادشاہوں کی کالی۔ پوری بیٹھک سناٹے میں آگئی تھی۔ ایک بزرگ کسان نے پٹھانی چہرے پر دھوپ چھاؤں بڑھتے ڈھلتے دیکھی تھی تو یہ کہہ کر مہرو کی بات پر مٹی ڈال دی تھی کہ ہاں بھائی مولا سائیں کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے اور پھر معجزوں' کراماتوں اور حادثوں کا ذکر چھڑ گیا تھا۔ ساری بیٹھک اللہ اللہ کرنے لگی تھی مگر جو بات مہرو کہہ گیا تھا۔ وہ بھولنے والی نہیں تھی۔ وہ ایک زبان پر سے دوسری زبان تک تیرتی ہوئی گھروں میں بیٹھی ہوئی عورتوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ لوگوں کا حافظہ مہرو کی ڈھال بن گئی تھی۔

ایک نوجوان نے مہرو کی چال پر معصوم سی پھبتی کسی تھی۔ مہرو نے ہنس کر جواب دیا تھا' کیا کروں بیٹے ایک ٹانگ چھوٹی جو ہوئی تم مولا کا شکر کرو کہ اپنی چال خود کوئی نہیں دیکھ سکتا' اگر تم اپنی چال دیکھ سکتے تو میری چال کا مذاق نہ اڑاتے۔ تم تو ایسے چلتے ہو جیسے کبڑا سائیکل چلا رہا ہے۔ اس روز سے وہ نوجوان پہلے سائیکل والا کبڑا' بعد میں صرف کبڑا اور دو تین سال میں اس کا پورا خاندان کبڑا مشہور ہوگیا تھا حالانکہ اس کی پشت تیر کی طرح سیدھی تھی۔

مہرو کی دو بیٹیاں اب بدن چھپانے لگی تھیں' کوٹھری میں نو بندے سانس لیتے تھے عمر کے ساتھ بچوں کے معدے بھی بڑھ رہے تھے اور ان کے قد بت بھی۔ مہرو اگر چاہتا تو اپنی دونوں بیٹیوں کو زمیندار گھرانوں میں کام پر لگا سکتا تھا۔ زمیندارنیوں کی خدمت کرنے کے لئے جتنی بھی نوکرانیاں ہوں' کم ہوتی ہیں۔ نوکروں کی تعداد سے ان کی شان بنتی ہے۔ نوعمر نوکرانیاں ہوں تو اور بھی اچھا ہوتا ہے۔ وہ بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہیں۔ ان کی وجہ سے زمیندار صاحب کا موڈ بھی اچھا رہتا ہے۔ وہ زیادہ دیر گھر میں رہتے ہیں اور زمیندارنی کو ان سے دو باتیں کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے مگر مہرو نے تو اپنی بیٹیوں کی مرغیوں کی طرح اپنی ڈربہ نما کوٹھری میں بند کر رکھا تھا' اسے زمینداروں کے لونڈوں کے لچھن معلوم تھے وہ آدم پکنے کا انتظار نہیں کرتے تھے۔ کچے ہی پال میں ڈال کر پکا لیتے تھے۔ اپنی کوٹھری پر سے ان کا سایہ اتارنے کے لئے اس نے اپنی صبحیں بھی سنسان کر لی تھیں۔ اس کے گھر میں رنگ رنگ کی چڑیاں پلی ہوئی تھیں جنہیں وہ لال پیلی پریاں کہہ کر پکارتا تھا اور پودے پودے پر جال ڈال کے پکڑ کر لایا تھا۔ صبح سویرے جب وہ سب مل کر چہچہاتی تھیں تو مہرو کا جی خوش ہوجاتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دماغ میں بیٹھا ہے اور اس کا حقہ اکبر بادشاہ کے دربار سے آیا ہے۔ اب بچوں کے ساتھ لڑکے بھی یہ خوبصورت چڑیاں دیکھنے کے لئے آنے لگے تھے۔ آپس میں ان کی گفتگو بھی ذومعنی ہوتی جا رہی

تھیں۔ مہرو کسی کو گھر سے تو نہیں نکال سکتا تھا۔ یہ تو جنگ کرنے اور دشمنی مول لینے والی بات ہوتی اور تنہا مسلی میں کسی کو دشمن بنانے کی تاب کہاں تھی؟ وہ صرف چڑیاں اڑا سکتا تھا اور ایک روز بیلے میں جا کر اس نے ساری چڑیاں آزاد کر دی تھیں' وہ ان کے پنجرے میں جھاڑیوں میں پھینک آیا تھا کہ اندھے لے لئے آنکھوں سے زیادہ بیکار چیز کوئی نہیں ہوتی۔

مجبوری میں بڑی طاقت ہے۔ وہ بڑے بڑے داناؤں کو بھی بے وقوف ثابت کر دیتی ہے وہ مجبور لوگ ہی تو ہوتے ہیں جو لشکر بن کر اجنبیوں کے لشکر پر ٹوٹ پڑتے ہیں' نہ جان' نہ پہچان' مفت میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔ فاتح اور مفتوح لشکروں کے مقتول ہمیشہ ایک ہی جگہ دفن ہوتے ہیں' ان کی روحیں جب ایک دوسرے سے ملتی ہوں گی تو پتہ نہیں کیا کہتی ہوں گی؟ کچھ کہتی بھی ہوں گی یا اجنبیوں کی طرح پاس سے گزر جاتی ہوں گی؟ البتہ پیچھے بیٹھ کر انہیں لڑانے والے فاتح اور مفتوح کے درمیان اس طرح کی گفتگو ضرور ہوتی ہے۔

بتاؤ اب تم سے کیا سلوک کیا جائے؟

وہی جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

یہ مجبوری کا ہی ایک کرشمہ تھا کہ مہرو اپنی دو بیٹیوں کو کپاس کے پھول چننے کے لئے ساتھ لے جانے لگا تھا۔ اس نے خوشحالی تو کبھی دیکھی ہی نہیں تھی مگر اب وہ روز بروز مفلس ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بے حد تنگ ہو گیا تھا۔ مسلن بھی اپنی بیٹیوں کی طرح حیران بھی ہوئی تھی اور خوش بھی۔ اس نے یہ کہہ کر مہرو کا حوصلہ بڑھایا تھا کہ لڑکیاں پرایا مال ہوتی ہیں۔ کل جب اپنے گھر جائیں گی تو انہیں کپاس کے پھول چننا تو آتا ہوگا سسرال والے انہیں پھوہڑ اور گنوار تو نہیں کہیں گے۔ مہرو کے یہ بات پسند آئی تھی مگر اس نے احتیاط ترک نہیں کی تھی۔ وہ کھیتوں میں بھی اپنی بیٹیوں کو اپنی نظروں سے باندھے رکھتا تھا۔ وہ بیچاریاں اپنے ساتھ پھول چننے والی لڑکیوں سے ہنس بول بھی نہیں سکتی تھیں۔ نوعمر لڑکے آس پاس کے کھیتوں میں گھوم پھر کر چلے جاتے تھے۔ ایسی خوبصورت لڑکیاں ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھیں وہ سب مہرو کی زبان سے ڈرتے تھے' جو چلنے پر آتی تھی تو تلوار بن جاتی تھی۔

مہرو زمینداروں کی بیٹھک میں تو مفلس اور مسکین بیربل تھا یا پھر ملا دو پیازہ کہہ لیجئے' جو محض پاپی پیٹ کی خاطر بادشاہ کو ہنسانے کے لئے مسخرہ بن گیا تھا مگر اپنی کوٹھڑی میں اس کی بڑی دہشت تھی' سارے بچے اس کے سامنے گونگے ہو جاتے تھے۔ وہ بڑا اتھ چھٹ تھا گھر میں کسی نے الٹی سیدھی بات کی اور اس نے دیا ایک ہاتھ مسلن سے وہ بڑی محبت کرتا تھا مگر سب سے زیادہ پٹائی بھی اسی کی کرتا تھا۔ وہ بھی تو مسلیوں کی بیٹی تھی۔ ذرا دیر کو بھی زبان سنبھال کے نہیں بول سکتی تھی۔ ڈانٹ پڑتی تھی تو وہ جواب میں منہ بھر کے گالی دیتی

تھی۔ مہرو کے مکے اس پر اولوں کی طرح برسنے لگتے تھے تو وہ بھاگ کر کوٹھری میں پناہ لینا چاہتی تھی۔ لیکن اس دوڑ میں وہ اپنے لنگڑے شوہر کو ایک بار بھی نہ ہرا سکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی' مہرو اندر ہوتا تھا۔ وہی چٹخنی چڑھاتا تھا اور پھر دھینگا مشتی اور گالی گلوچ کی آوازیں آپس میں گتھم گتھا ہو جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہانپتا کانپتا مہرو باہر نکلتا تھا اور مسلن کی گالیاں بھی نرم پڑتے پڑتے کوسنے بن جاتی تھیں' لڑکیاں جب چھوٹی تھیں تو دروازے سے لگ کر رویا کرتی تھیں پھر انہیں بھی یہ تماشہ دیکھ کر مزہ آنے لگا تھا۔ ان کے ماں باپ لڑ بھڑ کر پرسکون ہو جاتے تھے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر بچوں سے پیار کرتے تھے۔ مسلن اپنے آنسو پونچھ کر اس طرح کام میں جٹ جاتی تھی جیسے ابھی تازہ دم ہو کر آتی ہے۔ مہرو اس سے جتنا میٹھا بولتا تھا وہ بھی اتنا ہی مٹھاس بھرا جواب دیتی تھی۔

مہرو کی دوسری عادت چائے خوری تھی۔ یہ لت اسے نمبردار کے گھر سے بچپن میں لگی تھی۔ صبح آنکھ کھلتے ہی چائے کی ایک چینک اس کے سامنے نہ ہوتی تھی وہ بالکل بھوت بن جاتا تھا۔ جو چیز بھی ہاتھ لگتی تھی اسے اٹھا کر پٹخ دیتا تھا۔ گھر میں مٹی' چینی اور المونیم کے کل ملا کر پندرہ سولہ برتن تھے' انہیں بھی مہرو توڑ دیتا تو کوٹھری میں لکڑی کا ایک صندوق ہی رہ جاتا جس کی تہہ میں کپڑوں کے دو جوڑے پڑے تھے اور ان کے اوپر رپے کے تین زیور مینڈک کی طرح پھیل کے بیٹھے تھے۔ مسلن نور پیر کے وقت اٹھ کر خدا رسول کا نام لینے سے پہلے چائے بناتی تھی اور مہرو کو آنکھ کھلتے ہی چائے کی ایک چینک تیار ملتی تھی' وہ گرم گرم چائے جب پھونک پھونک کر پیتا تھا تو مسلن کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔

چائے کچھ ایسا مہنگا نشہ نہیں تھی' گڑ گھر کا تھا اور دودھ کے لئے بکری پلی ہوئی تھی۔ صرف چائے کی پتی دکان سے آتی تھی' دکان پر مہرو کا حساب چلتا تھا۔ وہ فصل کی فصل برابر ہوتا رہتا تھا۔ اب تو مہرو کا غصہ ایک بہانہ تھا۔ خود مسلن بھی چائے کے نشے میں پڑ گئی تھی۔ صبح صبح اگر چائے کے دو کوپ اسے نہ ملتے تو دن بھر اس کا بدن ٹوٹتا رہتا اور سر بھاری ہو جاتا تھا' بچے بھی چائے کے عادی ہو گئے تھے منہ ہاتھ دھونے سے پہلے اپنے اپنے پیالے اٹھا کر چولہے کے پاس بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں تھی۔ چائے کا نشہ تو مولوی صاحب بھی کرتے تھے۔ یہ راز جب زمینداروں کو معلوم ہوا تھا وہ ختم کراتے تھے تو کھانے کے بعد مولوی صاحب کو چائے کا ایک پیالہ بھی پیش کر دیتے تھے۔ اس سے ان کا لحن تر و تازہ اور ان کی دعائے خیر اثر انگیز ہو جاتی تھی۔

مہرو نے افلاس میں بھی ہنس کھیل کے زندگی گزاری تھی مگر اس کی عمر اندر سے اس طرح کٹ رہی تھی جیسے پیاز کتر رہا ہو۔ جب سے پٹھان زمیندار نے اس کے بچوں کے رنگ کی بات تھی' وہ اپنی بڑی بیٹی کی ہرنی کی سی معصوم آنکھوں سے نظر چرانے لگا تھا' اسے

اچانک احساس ہوا تھا کہ اس کی بیٹی سیانی ہوگئی ہے۔ دو سال تک اس نے اپنے آپ سے بحث کی تھی اور اب دل میں طے کر لیا تھا کہ اس فصل پر اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دے گا' اس کی سوچ کی لہریں نہ جانے کس طرح علاقے کے کنوارے مسلیوں کے گھروں میں گھوم گئی تھیں کہ پیغام پہ پیغام آنے لگے تھے۔ اس نے تو ابھی نمبردار کو بھی اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ اسے اپنے باپ کی جگہ سمجھتا تھا اور اس سے بڑی امیدیں وابستہ کئے بیٹھا تھا اس کی یہ بھی آرزو تھی کہ نمبردار اس کی بیٹی کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرے اور دولہا کے باپ کو گلے سے لگا کر کہے ہماری بیٹی کا خیال رکھنا۔

غریب آدمی کی سوچ میں جو خوف شامل ہوتا ہے۔ وہی اکثر اوقات حقیقت بن کر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ مہرو نے سیاہ بادلوں کو تیار فصل کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا تو اسکا دل دہل گیا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے دعا کی تھی کہ ہوا انہیں کسی اور ملک کی طرف اڑا لے جاتے لیکن بادل تو بپھرے ہوئے ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑتے ہوئے چلے آرہے تھے ان میں سے پہلے تو چوڑیاں توڑتی ہوئی جوان بیوہ کے آنسوؤں کے برابر قطرے ٹپکے تھے اور پھر آسمان سے زمین تک پانی کی چادریں تن گئی تھیں۔ مہرو گندم کی فصل کو بھول کر اپنی کوٹھڑی کی طرف بھاگا تھا جہاں اس کی اپنی فصل پناہ گیر تھی مہرو کو سب سے زیادہ اپنی چھت کی فکر تھی۔ اس کی بھوسہ اور گوبر ملی ہوئی مٹی اتنی تیز بارش کی کاٹ کب تک برداشت کر سکتی تھی' وہ کوٹھڑی میں بچھی ہوئی چٹائیاں اٹھا کر چھت پر چڑھ گیا تھا۔ اس نے پانی میں تیرتی ہوئی چٹائیوں کے کونوں پر اینٹیں رکھتے ہوئے سوچا تھا۔ دریا بادل کیسے بن گئے؟ اتنا بہت سا پانی ٹین کے دو پرنالوں میں سے کس طرح گزرے گا؟ بجلی کی کئی لہریں ایک ساتھ چمکی تھیں تو مسلن دروازے میں سے سر نکال کر چیخی تھی اور وہ گھبرا کر نیچے اتر آیا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک کھاٹ پر سارے بچے ڈرے سہمے بیٹھے تھے' پلنگ پر صندوق اور اس پر اناج کے کنستر ڈبے اور مرچ' مصالحے کی ڈبیاں رکھی تھیں مسلن گھٹنوں میں سر دبا کر صندوق کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مہرو پلنگ کے سرہانے اس طرح ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جیسے وہ کسی بینک کا گن مین' گڑ کی دو گٹھڑیاں چکی کے پاٹ پر محفوظ تھیں اور بکری ایک کونے میں بڑی بے نیازی سے چپ چاپ بیٹھی تھی۔

مہرو کئی بار بڑبڑایا تھا۔ ایسی بارش نہ دیکھی اور نہ سنی اب تو ندیاں نیر ہوگئی ہیں۔ اسکی بڑبڑاہٹ کو بھی بادلوں کی گھن گرج نگل گئی تھی۔ بادل اپنے آپ کو ہلکا کر کے خوش ہو رہے تھے۔ وہ برستے ہی چلے گئے تھے' پانی پاگلوں کی طرح ٹکریں مارتا پھر رہا تھا۔ وہ مہرو کی کوٹھڑی کی اونچی دلیز بھی پھلانگ گیا تھا' مہرو ابھی بادلوں کی بے مہری کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی آئی اور ایسا اودھم مچایا کہ درخت بھی چیخنے اور رونے لگے تھے۔ ہوا کی خرمستی دیکھ کر مہرو نے کہا تھا اب تو مولا ہی ہے جو کچھ بچا لے اس کی آواز

اتنی مرجھلی تھی کہ سارا کنبہ لرز گیا تھا۔ انہوں نے مہرو کی ایسی ڈوبتی ہوئی آواز کبھی نہیں سنی تھی۔

رات کو آسمان کھلا تھا تو لوگ لالٹینیں اور ٹارچیں لے کر گھروں سے نکلے تھے۔ کھیت تو ایسا لگتا تھا کہ طغیانی پر آئے ہوئے کسی دریا کا پاٹ ہیں۔ ٹارچ کی روشنی کی دھار جہاں تک پہنچتی تھی۔ پانی کی چمک بن جاتی تھی۔ سب لوگ توبہ، توبہ کرتے ہوئے گھروں کو لوٹ گئے تھے، صبح مولوی صاحب کی روتی ہوئی آواز میں اذان سنائی دی تھی تو سارا گاؤں باہر نکل آیا تھا، جوں جوں روشنی بڑھتی گئی تھی لوگوں کے دل بیٹھتے گئے تھے۔ گندم کی پکی پکائی فصل کیچڑ میں مل گئی تھی۔ کئی لوگوں کے پیٹ ابھی سے بولنے لگے تھے۔ مطلع صاف تھا، ہوا خنک تھی اور درخت دھلے ہوئے تھے مگر دیکھنے والوں کی آنکھوں پر خوف کے پردے پڑ گئے تھے۔

مصیبت جب بھی آتی ہے۔ لاؤ لشکر لے کر آتی ہے۔ قیامت کی ایک بارش نے چھ ماہ کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا مگر تباہی کی بھوک ابھی نہیں مٹی تھی۔ وہ کپاس کی فصل بھی چٹ کر گئی تھی۔ کسانوں کی بددعائیں تو زہریلی مکھی کے نام لکھی گئی تھیں، مگر قصور دکھن کی ہوا کا تھا، جو کپاس کے ڈوڈوں پر سے زہریلی مکھی اڑا دیتی ہے۔ اس سال دکھن کی ہوا شاید راستہ بھول کر پچھم یعنی مغرب کو چلی گئی تھی یا اسے مغرب والوں نے اسے کسی چکر میں ڈال دیا تھا۔ مغرب والے بڑے ترقی یافتہ لوگ ہیں، بہت کچھ کر سکتے ہیں، بہت کچھ کرتے ہیں اور بہت کچھ کر چکے ہیں، فصلوں پر چھڑکی جانے والی کیڑے مار دوا بھی انہوں نے ہی بنائی ہے اور وہی بھیجتے ہیں مگر اس سال وہ بھی ملک سے اڑ گئی تھی۔ زمیندار لوگ پیسے لئے پھرتے تھے اور زیادہ سے زیادہ دام دینے کو تیار تھے لیکن کیڑے مار دوا کہیں ہوتی تو ملتی۔ اسے لانے والا جہاز مغرب کی کسی مصروف بندرگاہ میں پھنس گیا تھا۔

ہوائیں ان کی، فضائیں ان کی
سمندر ان کے، جہاز ان کے

چنانچہ کپاس کے ڈوڈوں پر مکھی بیٹھ گئی تھی۔ اس کے انڈوں سے نکلنے والے کیڑوں نے کپاس کے پھول اندھے کر دیئے تھے۔ باقی کیا بچا؟ ایندھن اور وہ بھی ایسا کہ آگ دکھاتے ہی بھک سے اڑ جاتا ہے۔

بادل شاید ڈیڑھ سال بھر کا کوٹا قیامت کی اس شام کو پورا کر گئے تھے۔ آسمان پر لق و دق صحرا کا گمان ہونے لگا تھا۔ لوگ بادل کا ایک مرغولہ دیکھنے کو ترس گئے تھے نہر مرے ہوئے سانپ کی طرح خاموش پڑی تھی، نئی فصل کے لئے اعلیٰ قسم کا بیج باہر سے منگایا گیا تھا، وہ اول تو پھوٹا ہی نہیں تھا اور اگر کہیں پھوٹا تھا تو پھوٹ کے شرما رہا تھا۔ دیسی زمین نے ولایتی بیج قبول نہیں کیا تھا یا ولایتی بیج کو دیسی زمین پسند نہیں آئی تھی۔ اس لئے وہ خاک میں مل کر بھی "گل وگلزار" نہ بنا تھا۔ ریڈیو سے پل پل کی خبریں مل رہی تھیں، ہر طرف

تباہی پھر گئی تھی مہرو کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسے ابھی ایک سال اور اپنی بیٹی پر پہرہ دینا ہے۔

بھوک آہستہ آہستہ پورے گاؤں میں پھیل رہی تھی' پہلے سبزہ کم ہوا تھا' پھر جانور اور پھر آدمی' لیکن کتنے لوگ ہیں جو گھر بار چھوڑنے کی ہمت رکھتے ہیں' بھوک کے کوڑے کھا کر چھوڑنا بھی چاہیں تو زمین کی وہ مٹی قدم پکڑ لیتی ہے جس پر ان کی عمر کے سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے' جو انہیں اپنے دل کی طرح اپنی لگتی ہے اور جس کا ذرہ ذرہ ان کا آشنا ہوتا ہے اور پھر آدمی ایک امید کی دہلیز دوسری امید کے سہارے ہی پھلانگ سکتا ہے' جب مایوسی ہر طرف ایک امید کی دہلیز دوسری امید کے سہارے ہی چھلانگ سکتا ہے' جب مایوسی ہر طرف چراغاں کئے کھڑی ہو تو انسان بھی چوہے کی طرح اپنے بل میں دبک کر کسی معجزے کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ وہ ہتھیار ڈال کر سوچتا ہے کہ موت کو آنا ہی ہے تو اپنے گھر میں آئے' کم سے کم قبر تو باپ دادا کی قبروں کے ساتھ بنے گی' مگر انسان بھی کیا چیز ہے؟ موت سے بچنے کے لئے لوگ قبرستان کے بعض درختوں کی چھال تک پکا کے کھا گئے تھے۔ قبروں پر اگا ہوا بچا کھچا سبزہ ڈھور ڈنگروں کا چارہ بن گیا تھا۔ بھوک نے قبرستان کی ہیبت اور باپ دادا کی قبروں کا احترام ختم کر دیا تھا۔ انسانوں سے اچھے تو پرندے تھے وہ چپ چاپ علاقے سے اڑ گئے تھے۔ انہوں نے کسی درخت اور کسی قبر کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ان کے جانے کے بعد لوگوں کو اندازہ ہوا تھا کہ کوے کی کائیں کائیں کتنی سریلی ہوتی ہے۔ اب تو صرف گدھ ہی نظر آتے تھے' وہ تین چار چار کی ٹولیوں میں اپنے بڑے بڑے بھورے پر پھیلا کر اور اونٹ کی طرح گردن اٹھا کر ہوا میں تیرتے پھرتے تھے۔ انہیں دیکھ کے لوگ اور زیادہ دہشت زدہ ہو جاتے تھے گدھ تو صرف اسی علاقے کے اوپر چکر کاٹتے ہیں جہاں انہیں کوئی مردار ملنے کی امید ہوتی ہے' وہ اپنا وقت بالکل ضائع نہیں کرتے' اسی لئے انہیں مفلس ملکوں کی فضا بے حد پسند ہے۔ وہ دور دور سے آتے ہیں اور مقامی گدھوں کو ساتھ ملا کر جاں بلب اور مردہ جانور آسانی سے تلاش کر لیتے ہیں کم بختوں کی چونچیں لوہے سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی ہڈیاں توڑ کر ان میں سے گودا نکال لیتے ہیں' گاؤں کے لوگوں کو وہ چمکتے ہوئے جہاز بھی گدھ لگنے لگتے تھے جو صبح سویرے اور شام ڈھلے ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے تھے مگر ان کی گونج دیر تک گاؤں والوں کے کان کھرچتی رہتی تھی۔

بھوک کا محاصرہ جوں جوں تنگ ہوتا جا رہا تھا مفلس گھرانوں کے بوڑھوں کی کھال لٹکتی جا رہی تھی' مہرو کہتا تھا کہ آدمی کی جلد جب اس کا گوشت پوست چھوڑنے لگے تو جان لو کہ موت اس کی نبض دیکھ رہی ہے مگر یہاں تو ایسا لگتا ہے موت بھی فاقوں ماری بنے لاغر بوڑھیوں کی طرح دیواروں کا سہارا لے کر ٹھنک ٹھنک کے چل رہی ہے۔ مہرو کی آدھی بات غلط تھی۔ اس نے کسی بھوک سے مرتے ہوئے دیکھا ہوتا تو اسے پتہ ہوتا کہ بھوک سے مرنا مشکل ہی نہیں ہوتا' بہت لمبا بھی ہوتا ہے۔ فاقہ کشی کی موت زندگی کو لقمہ لقمہ کر کے

نکلتی مرنا مشکل ہی نہیں ہوتا' بہت لمبا بھی ہوتا ہے۔ فاقہ کشی کی موت زندگی کی لقمہ لقمہ کر کے نگلتی ہے اور گھلا گھلا کر اس وقت مارتی ہے جب انسان میں سانس لینے کی بھی سکت نہیں رہتی۔

مہرو کے کنبے کو بھی اب بھوک نچوڑنے لگی تھی۔ اس کا دل بجھ گیا تھا اور اس کی باتوں میں سے چاشنی اڑ گئی تھی۔ وہ ہر وقت دماغ لڑاتا رہتا تھا مگر بھوک اس کی من کی آنکھوں میں دھول جھونک کر انہیں بھی اندھا کر دیتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی کوئی ترکیب نہیں سوچ سکتا تھا' اس نے کئی بار لیٹے لیٹے اپنے آپ کو مرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن جونہی اسے روتی ہوئی بیٹیاں اور بین کرتی ہوئی مسلن نظر آتی تھی' وہ تنومند آدمی کی طرح اٹھ کے بیٹھ جاتا تھا' عجیب سی بات ہے۔ انسان مرتے وقت بھی زندگی کے بارے میں سوچتا ہے۔

مسلن اب مہرو کے ہاتھ سے مار کھانے کو بھی ترس گئی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اسے چڑانے والی بات کرتی تھی اور جب وہ بوڑھے بیل کی طرح منہ موڑ لیتا تھا اسے بہت رونا آتا تھا۔ وہ اب بھول کر بھی چائے کا نام نہیں لیتا تھا اور حقہ بھی صرف نمبردار کی بیٹھک میں ہی پیتا تھا' گھر کے لئے تمبا کو ادھار خریدنا پڑتا تھا اور دکاندار اب اس طرح ادھار دیتا تھا۔ جیسے کسی اڑیل فقیر کو خیرات دے رہا ہے۔ اس نے بکری بھی بیچ دی تھی۔ وہ بکری سے واقعی پیار کرتا تھا' اسے قصاب کے حوالے کرتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے' اسے یوں لگا تھا جیسے بکری کی بڑی بڑی آنکھیں بھی گیلی ہو گئی تھیں مگر وہ کرتا بھی کیا؟ گھر میں گھاس' چھال اور بوٹیاں ابال کے کھائی جا رہی تھی' بکری کو کیا کھلاتا؟ وہ قصاب کی چھری سے نہ کٹتی تو انسانوں کی طرح بھوک سے کٹ کٹ کے مرجاتی' اس کے لئے تو موت آسان ہو گئی تھی' لمحہ بھر کر تڑپی ہو گی اور سارے دکھوں سے آزاد ہو گئی ہو گی۔ مہرو کی نظر جب بھی خالی کھونٹے پر پڑتی تھی تو اس کے دل سے بکری کے لئے یہ دعا نکلتی تھی کہ اس کی نیک خصلت روح کو جنت کی نہروں کے کنارے ایسے پودے ملیں' جن کی کونپلیں سدا پھوٹتی رہیں۔

ایک دن مسلن نے مشورہ دیا تھا کہ ساری خدائی میں تو ایسا کال نہیں پڑا ہو گا کہ بندہ ساگ کے پتے پتے کو ترس جائے' چلو کسی اور گاؤں یا شہر چلتے ہیں شاید وہاں روٹی کا کوئی وسیلہ نکل جائے۔

کیا کہا اپنا ملک چھوڑ دوں جواب میں چھ سات ماہ پرانا مہرو غرایا تھا۔ دوسری جگہ تو تمہارے باپ دادا کے مربعے ہیں نا جو وطن سے بے وطن ہو جاؤں در در کی ٹھوکرے کھاؤں' رہیں نا مسلن کی مسلن ایک جگہ بیٹھ کے چین نہیں پڑتا' گدھوں اور جھگیوں اور رضائیوں کے ساتھ بچے بھی لاد کر گاؤں گاؤں کی خاک پھانکنے میں مزہ آتا ہے۔ اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھ کر اس کی آواز بھی دھیمی پڑ

گئی تھی۔ یہاں سر پر ایک چھت تو ہے اپنے گھر میں تو بیٹھے ہیں یہ کوٹھڑی چھوڑ دی تو نمبردار ناراض ہو جائے گا۔ ہماری کوٹھڑی گرا کر اپنے احاطے میں شامل کرلے گا پھر تو ہمیں جھونپڑی ڈالنے کے لیے بھی جگہ نہیں ملے گی۔ اس کی آواز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگی تھی۔ مجھے نہ گھگو گھوڑے بنانا آتے ہیں اور نہ چھاج چھکوڑ' میں نے تو کبھی اینٹیں بھی نہیں تھوپیں میرے پاس تو گدھا بھی نہیں ہے' میں تو بین بھی نہیں بجا سکتا' سانپ بھی نہیں پکڑ سکتا' مجھے تو فصل کاٹنے اور گڑ بنانے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا' میں نہ ٹیپ (ٹاپیسٹ) نہ منشی کسی اور جگہ جا کر کیا کروں گا؟ یہیں ذرا کرم کرے گا' ایک فصل اچھی ہوئی تو مصیبت کے یہ دن بھول جائیں گے۔

نمبردار کی بیٹھک میں اب ریڈیو صرف خبروں کے وقت ہی لگتا تھا مہرو کو اس بات کا دکھ تھا کہ ایسے برے دنوں میں سائیں مرنا کا اک تارا بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ وہ خبریں بھی شوق سے سنتا تھا۔ ان دنوں بھی خبروں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہیں ہوتا تھا مگر یہ غضب بھی نہیں تھا کہ پانی کو دودھ کہہ کر اسے باجوں تاشوں کے ساتھ پیش کیا جائے۔ مہرو خبروں پر مزے مزے کے تبصرے کرتا تھا اور عجیب عجیب نکتے نکالتا تھا مگر اب خبریں بھی اسے ذرا سا پریشان کرنے لگی تھیں۔ وہ سوچتا تھا کہ ہمارے بڑے بڑے لیڈر' وزیر اور افسر جو ہمارے سروں کا تاج ہیں' دنیا بھر میں امداد کیوں مانگتے پھرتے ہیں؟ وہ بھی اپنے پیٹ پر پتھر کیوں نہیں باندھ لیتے' وہ بھی اگلی فصل کا انتظار کیوں نہیں کرتے؟ اس کا خیال تھا کہ وزیر اور افسر بھوک سے تنگ آ کر اپنا وطن چھوڑ رہے ہیں وہ انہیں کم حوصلہ سمجھتا تھا اور چپکے چپکے ان کی عقل کا ماتم بھی کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس کی سوچ زبان پر آگئی تھی تو نمبردار خوب ہنسا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مہرو نہ تو ہنسی میں شامل ہوا تھا اور نہ ترکی بہ ترکی جواب دے سکا تھا۔ نمبردار نے کہا تھا بھولے آدمی یہ بادشاہ لوگ صرف قوم کی خاطر فقیر بنے ہیں' ملک ملک سے امداد مانگتے پھرتے ہیں' ان کی اپنی بات ہو تو اللہ نے انہیں بہت کچھ دے رکھا ہے' پانچ سال بھی فصل نہ ہو تو جب بھی ان کی دولت کم نہیں ہوگی اور مہرو سوچ رہا تھا کہ نمبردار نے کتنے کوے کھائے ہوں گے جو اس کے بال ابھی تک سیاہ ہیں۔ وہ بچپن سے ان کا ایسا ہی رنگ دیکھتا آ رہا تھا۔

ایک روز ریڈیو پر خبر آئی تھی کہ گندم سے لدے ہوئے جہاز چل پڑے ہیں۔ نمبردار یہ خبر سنتے ہی جیسے پھر سے جوان ہو گیا تھا۔ بیٹھک میں موجود کئی دوسرے لوگوں نے بھی ''زندہ باد'' کا نعرہ لگایا تھا۔ نمبردار نے اپنی خشخشی داڑھی جھاڑتے ہوئے کہا تھا۔ کچھ دنوں میں دیکھنا مہرو' ہر طرف گندم کے ڈھیر لگے ہوں گے' دوست ہوں تو ایسے ہوں۔

مدح' یہ گندم تو بڑی مہنگی ملے گی' کرایہ بہت پڑے گا؟ مہرو نے بڑی سادگی سے پوچھا تھا اور نمبردار نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تھا۔ سنا نہیں یہ تحفہ ہے' مفت ملی ہے' تحفے کی قیمت پوچھ کر دوستوں کو شرمندہ نہیں کرتے' صرف ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مہرو نے سر تو ہلا دیا تھا مگر یہ بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی کہ گندم سے بھرے ہوئے جہاز مفت کیسے مل سکتے ہیں؟ یہ تحفہ دینے والے کو کیا ملے گا؟ یہاں تو دن رات خدمت جہاز مفت کیسے مل سکتے ہیں؟ یہ تحفہ دینے والے کو کیا ملے گا؟ یہاں تو دن رات خدمت کر کے باسی روٹی کے دو نوالے بھی نہیں ملتے۔ چیتر کے مہینے میں اپنی اترن دیتے ہوئے بھی زمیندار سوچتے ہیں کہ کپڑا اچھا خاصا ہے۔ اگلے چیتر تک چلایا جا سکتا ہے وہ راز مہرو کی سمجھ سے باہر تھا جو جہاز کے مستول پر چڑھ کر مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا' اس وقت کہاں تھا، لیکن ایسا بہتر سالہ جواں مرد جو سطح سمندر سے جزیرہ گریناڈا کا پتہ اٹھا لیتا اسے دم سے پکڑ کر چوہے کی طرح دنیا کی آنکھوں کے سامنے لہراتا اور کہتا دیکھو بڑی قوتوں کا مفاد کہاں تک پہنچتا ہے۔

نمبردار کی بیٹھک سے اٹھ کر مہرو گھر کی طرف آ رہا تھا کہ اس کے دل میں اتنے زور کا درد اٹھا تھا کہ وہ سمٹ کر اپنی چھوٹی ٹانگ کے برابر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو نمبردار کے پوتے سے یہ پوچھتے ہوئے سن لیا تھا کہ ''کیا تمہارے گھر میں روٹی پکتی ہے؟''

ہاں روز پکتی ہے' نمبردار کے پوتے نے ایسی بے یقینی سے جواب دیا تھا' جیسے گھر ہو اور روٹی نہ پکے' یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟

نہیں' ہمارے گھر میں تو بہت دنوں سے روٹی نہیں پکی' دانے ختم ہو گئے ہیں نا۔

اس کے بیٹے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا تھا۔ ہمارے گھر میں تو گڑ بھی ختم ہو گیا ہے۔

آج تم گھر مت جانا' میں تمہیں روٹی دوں گا۔ نمبردار کا پوتا بھی نمبردار کی طرح بول رہا تھا۔

نہیں' کھانے کے وقت بی بی جی کہیں گی' گھر جاؤ' تمہاری ماں بلا رہی ہے' گھر جا کے ماں سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتی ہے کھانے کے وقت دوسروں کے گھروں میں نہیں بیٹھتے۔

اس وقت مہرو کا جی چاہا تھا کہ گندم سے بھرا ہوا جہاز کھینچ کر گاؤں میں لے آئے' گھر گھر میں تندور گرم کرائے اور اتنی روٹیاں لگوائے کہ گاؤں کے بچے گلیوں میں پھینکتے پھریں' لیکن جہاز کو سمندر میں تھے اور نمبردار کہتا تھا کہ سمندر ہزاروں کوس پر پھیلا ہوا ہے۔ ساری دنیا کے دریا مل کر بھی سمندر کا ایک کونا نہیں بھر سکتے۔

اس روز مہرو نے رپے کی بھانجن نکال کر اپنا صندوق خالی کر دیا تھا۔

جھانجھن بیچتے وقت مہرو کو بڑا دکھ ہوا تھا مگر بکری کو قصاب کے حوالے کرتے وقت اپنی بیٹیوں کو کپاس کے پھول چننے کے لئے کھیتوں میں لے جاتے ہوئے' چہچہاتی ہوئی چڑیاں آزاد کرنے کے سے اور مسلن کو زمیندار گھرانوں کی ٹوکری اٹھاتے دیکھ کر بھی تو

اس کا دل زخمی ہوا تھا' آدمی کے اندر کیسی کیسی دراڑیں ہوتی ہیں جو اسے خود بھی نظر نہیں آتیں اپنا دل نکال کر کون دیکھ سکتا ہے؟

یہی جھانجھن چھنن چھنن کرتی ہوئی مسلن اس کی کوٹھڑی میں آئی تھی وہ دالان میں دولہا بنا کھڑا تھا اور جھانجھن کے نغمے پر ہی قربان ہو گیا تھا۔ جھانجھن کی بہت کم قیمت لگی تھی' قحط پڑے تو اناج کے سوا ہر چیز سستی ہو جاتی ہے۔ سونا بھی' سونے ایسے انسان بھی' جھانجھن تو پھر رپے کی تھی' اسے جتنے پیسے ملے تھے' وہ ان سے آٹا خرید لایا تھا اور مسلن سے کہا تھا سارے آٹے کی روٹیاں پکا دو' سب پیٹ بھر کے کھائیں گے۔

ایک شام گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی' صاحب ضلع کے دفتر کا پیادہ نمبردار کے نام یہ پیغام لایا تھا کہ ایک بہت بڑے افسر علاقے کا دورہ کرنے آ رہے ہیں' وہ سب سے پہلے تمہارے گاؤں میں آئیں گے۔ وہ اپنے ساتھ گندم کا ایک ٹرک بھی لائیں گے اور موقع پر ہی تقاوی (قرض) کی منظوری کر کے اپنے سامنے تقسیم کرا دیں گے۔ ایک گورا افسر بھی ان کے ہمراہ ہوگا۔ وہ علاقے کا دورہ کرنے کے بعد اپنی حکومت کو رپورٹ بھیجے گا۔ جہاں تک ہو سکے' اسے خرابہ اور ویران زمین ہی دکھائی جائے' اس کی رپورٹ پر مزید امداد ملے گی' ملک کا بڑا فائدہ ہوگا۔ یہ امدادی پارٹی ایک رات گاؤں میں گزارے گی۔ اس کا اچھی طرح استقبال کیا جائے اور اس کی خاطر مدارت کرنے میں کوئی کمی نہ رہنے دی جائے۔

یہ پیغام پا کر نمبردار کی باچھیں کھل گئی تھیں' اس کے خاندانی رجسٹر سندات پر اتنے بڑے افسر کے دستخط نہیں تھ۔ چھوٹے موٹے افسروں نے اس کی اور اس کے باپ کی خدمات کو سراہا تھا' ان میں دو تین انگریز افسر بھی تھے لیکن اتنے بڑے حاکم کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی' نمبردار نے چمکتے ہوئے سنہرے کاغذ میں لپٹے ہوئے اپنے رجسٹر سندات کو صندوق میں سے نکال کر باہر رکھ دیا تھا کہ وقت پر اس کی ڈھنڈیا نہ پڑے۔ دوسرے زمیندار بھی سرتاپا شکر گزار تھے۔ سرکار نے پہلے مالیئے اور آبیانے کی وصولی روک کر ان پر کرم کیا تھا اور اب ان کے لئے اتنے بڑے افسر کے ہاتھ گندم اور پیسے بھی بھیج رہی تھی۔

امدادی پارٹی کی آمد سے ایک دن پہلے سب زمیندار گھرانوں سے نئی نئی کرسیاں صاف ستھرے بستر اور چمکتے ہوئے برتن نمبردار کے گھر پہنچ گئے تھے۔ کھانے پینے کا سامان اور کھانا پکانے والا باورچی ڈپٹی کمشنر نے شہر سے بھیجا تھا۔ نگرانی کرنے کے لئے اس کے دفتر کے وہ اہلکار بھی ساتھ آئے تھے۔ نمبردار کا گھر عارضی ''ڈاک بنگلہ'' بنا دیا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف کاغذ کی نیلی پیلی جھنڈیاں سجا دی گئی تھیں۔ گاؤں میں چند بچی کھچی مرغیاں ٹائیں ٹائیں پٹاخ پکارنے لگی تھیں۔ انہیں شاید فضا میں چمکتی ہوئی چھریاں نظر آ گئی تھیں چھٹی حس تو ہر جاندار میں ہوتی ہے اور مرغیاں بھی جان رکھتی ہیں۔

بڑے صاحب جیپ سے اتر کر اپنے عملے فعلے کے ساتھ نمبردار کی بیٹھک میں چلے گئے تھے۔ گورے صاحب اپنی جیپ میں گاؤں کے اردگرد کا ایک چکر کاٹتا تھا کھیتوں میں بگولے گھوم رہے تھے مگر گورے صاحب کی نظریں چند سوکھے سیاہ بے رگ درختوں پر لگی ہوئی تھیں وہ قدرت کے اس تجریدی کمال پر سردھن رہا تھا جب اسے بتایا گیا تھا کہ درختوں کا یہ رنگ اور حالت قدرتی نہیں ہے۔ بھوکے لوگ ان کی چھال تک اتار کے لے گئے ہیں تو اس کے منہ سے افسوس کے چند کلمات نکلے تھے۔ اس کے دل میں درختوں کے لئے رحم کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔

جیپ سے اتر کر گورا صاحب گاؤں کی گلی میں داخل ہوا تھا تو چند سوکھے سڑے ادھ ننگے بچے اس کا راستہ کاٹ گئے تھے' پہلی نظر میں وہ اسے نوادر لگے تھے اور اسے اپنی بیوی کی یہ فرمائش یاد آگئی تھی کہ پرانی تہذیب کی کوئی نادر اور تاریخی چیز ضرور لیتے آنا' اپنے ڈرائنگ روم میں سجائیں گے۔ اس نے بچوں کی طرف پلٹ کے غور سے دیکھا تھا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ گورے کے قدم بھی تیز ہو گئے تھے' اس نے شاید سوچا تھا کہ نوادر تو بے جان ہوتے ہیں' یہ بچے تو بھاگ رہے ہیں' یہ تو اناج کے دشمن ہیں میرے ملک کا سارا اناج چٹ کر جائیں گے۔

گاؤں کی اکثر عورتیں اور لڑکیاں کچی دیواروں پر کہنیاں اور ٹھوڑیاں ٹکائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گورے صاحب کو دیکھ رہی تھیں' زمیندار گھرانوں کی عورتیں بھی پردے کی اوٹ سے گورے کی ایک جھلک دیکھنے کو کھڑی تھیں۔ اس کے تازہ دھلے ہوئے گوشت ایسے رنگ پر بھورے تلوں کا جال دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک بزرگ خاتون نے کہا تھا اللہ کی شان ہے' کتنا پھیکا رنگ ہے اور کتنا بڑا نام ہے۔

گورے کے ولایتی بوٹوں پر جوں جوں دیسی خاک چڑھ رہی تھی اس کی چھوٹی چھوٹی کنجی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔ اس نے اتنے بہت سے کچے گھر کبھی نہیں دیکھے تھے۔ چلتے چلتے اس نے بچوں کی طرح کئی کچی دیواروں پر مکے مارے تھے وہ تو پتھر کی طرح سخت تھیں' اسے دیسی کلچر کا یہ رخ بڑا پسند آیا تھا۔ مٹی کے کٹے پھٹے تودوں ایسے گھر اسے بڑے رومانٹک لگے تھے۔ ان کے بے ڈھنگے پن میں بھی اس نے ایک ڈھنگ ڈھونڈ لیا تھا' اپنی اس دریافت پر وہ بہت خوش تھا۔ اسے پہلے ہی گاؤں میں اپنے مضمون کی پہلی قسط کے لئے بہت سا مواد مل گیا تھا' یہ مضمون وہ اپنے ملک کے ایک کلچرل میگزین میں چھپوانا چاہتا تھا۔

ابھی وہ اپنے مضمون کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مہرو کی دالان کی دیوار پر جھانکتی ہوئی دس آنکھیں اس کی دو آنکھوں میں سماگئی تھیں' اس نے رک کر ان میں سے دو سیاہ آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تھی جنہوں نے اجڑی ہوئی جوان صورت پر اپنا ہالہ پھیلا رکھا

تھا اس نے ایک مقامی افسر سے کچھ پوچھا تھا۔ اس نے گاؤں کے چوکیدار سے وہی سوال کیا تھا اور اس کا جواب گورے صاحب کی زبان میں اسے سنا دیا تھا۔ اس دوران میں گورے کی نظریں بھونرے کی طرح اسی ایک چہرے کے گرد طواف کرتی رہی تھیں۔ اس نے شاید ایسا ستھرا سفید رنگ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چوکیدار کا جواب سن کر گورے کی بھوری بھنویں چڑھ گئی تھیں اور اس کا ماتھا سلوٹوں میں سمٹ کر آدھا رہ گیا تھا۔ وہ شاید حیران تھا کہ یہ بھانک قسم کے لوگ اتنے بچے کیوں پیدا کرتے ہیں؟ انہیں اناج کی امداد دینے کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی کا سبق بھی پڑھانا ہوگا۔

گورے صاحب نے جاتے جاتے مڑ کر اس چھوٹی دیوار کو دیکھا تھا جس کی منڈیر پر ہرنی کی سی معصوم آنکھیں حیرت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ ان آنکھوں اور اس چہرے کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا مگر اس دیوار سے آگے گلی کے موڑ تک کچی دیواروں کی الگنیوں پر سوکھتے ہوئے بہت سے چہروں میں جڑی ہوئی آنکھیں اس پر جھپٹ رہی تھیں' وہ گھبرا کر پلٹا تھا اور تیز تیز قدم دہراتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ چلنے والے دو دیسی افسروں کی ٹانگوں میں بھی پھرتی آ گئی تھی' انہیں غالباً ڈر تھا کہ گورے سے دو قدم پیچھے رہ گئے تو دو دن کی تنخواہ کٹ جائے گی۔

نمبردار کی بیٹھک میں بڑا صاحب قرض کی رقم منظور کرتا تھا اور اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تحصیلدار گن گن کر روپے ادا کر دیتا تھا۔ مہرو نے دیکھا تھا کہ نمبردار کی گردن کچھ لمبی ہو گئی تھی' ہر قرض خواہ کی درخواست اس کے دستخطوں کی مکڑی دیکھ کر ہی منظور کی جاتی تھی۔ قرض اسی کو مل سکتا تھا جسکی زمین ہو' بیل ہوں اور جس کا نام پٹواری کی کھتونی میں درج ہو' مہرو کے پاس نہ زمین تھی' نہ بیل تھے اور نہ پٹواری کی کھتونی میں اس کا نام لکھا تھا۔ اسے کس حساب میں قرض ملتا۔ اس کے سامنے رنگ رنگ کے نوٹ اچھل رہے تھے مگر اس تک آتے آتے وہ کسی دوسرے کی انگلیوں میں اٹک جاتے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جس کسی کو نوٹ مل جاتے تھے اس کے چہرے پر بھرے پیٹ کی لالی پھر جاتی تھی۔ وہ حقہ گھماتے ہوئے بیٹھک کے چاروں کونوں میں گھوم گیا تھا مگر اس کے ہاتھ میں تمباکو بو کے سوا کچھ نہ آیا تھا۔

مولوی صاحب بھی کلف لگی پگڑی باندھ کے اور تیل سے اپنی داڑھی سینچ کر آئے تھے' ان کے ٹھاٹھ دیکھ کر مہرو نے سوچا کہ بی بی جی نے چاولوں کی پوٹلی کہاں چھپا رکھی تھی؟ آج تو مولوی صاحب کی پگڑی پھولی ہوئی اور طرہ اکڑا ہوا ہے۔ ان کی آنکھوں میں سرمے کی دھار بھی اچھی لگ رہی تھی مگر ان کا چہرہ آہستہ آہستہ لٹکنے لگا تھا۔ وہ بیچارے بھی تو مہرو کی طرح تھے' مسجد خدا کی تھی اور حجرہ مسجد کا' انہیں کس حساب میں قرض ملتا' ان کے ہاتھ ان کی گود میں اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کی ہتھکڑی بن گیا

تھا۔

گورا صاحب گاؤں کا معائنہ کرکے بیٹھک میں داخل ہوا تھا تو بڑا صاحب یوں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا تھا جیسے مزے سے بیٹھ کر جگالی کرتے ہوئے بیل کی کمر پر ایک زوردار لاٹھی پڑ جائے' دوسرے لوگ بھی ایک ہی جھٹکے میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ گورے نے اپنی زبان میں کچھ کہا تھا اور بڑا صاحب فوراً کرسی میں دھنس گیا تھا۔ اس کے چہرے پر رعب آہستہ آہستہ واپس آگیا تھا' وہ بچی کچی عرضیاں نمٹانے میں مصروف ہو گیا تھا اور گورا صاحب مہرو کو گھورے چلا جا رہا تھا۔ اس نے شاید پہلی بار کوئی لنگڑا آدمی دیکھا تھا یا مہرو کا لنگ ہی کچھ انوکھا تھا۔ کوئی بات تو تھی کہ گورا صاحب اپنے پاس بیٹھے ہوئے دیسی افسر سے بار بار کچھ پوچھتا رہا تھا۔

ٹرک سے گندم کی بوریاں اترنے لگی تھیں تو بوڑھوں کی بھوک بھی بچوں کی طرح چمک اٹھی تھی۔ ایک ایک کرکے ساری بوریاں نمبردار کے پختہ گودام میں غائب ہو گئی تھیں۔ نمبردار کو عارضی طور پر ڈپو ہولڈر بنا دیا گیا تھا۔ گندم کے بہت کم دام مقرر کئے گئے تھے۔ مگر دام تو تھے اور وہی لوگ ادا کر سکتے تھے جن کی جیب میں پیسے تھے۔ یہ گندم مفت تقسیم کرکے حکومت اپنی آزاد اور خودمختار قوم کی خودی اور خودداری کو مجروح نہیں کر سکتی تھی عزت نفس سے بڑی کوئی دولت نہیں ہے' اسے ہر قیمت محفوظ رکھنا چاہیے اسی لئے تو حکومت لوگوں کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھانا چاہتی تھی کہ حلال کی روزی صرف وہ ہے جو خون پسینہ ایک کرکے کمائی جائے۔ اس نے قوم کو نیا نظریہ یا نعرہ دیا تھا۔

محنتی کسان' ملک کی آن۔

حکومت اور چند افراد تو بھکاری ہو سکتے ہیں مگر پوری کی پوری قوم بھکاری کیسے ہو سکتی ہے۔

یہ فیصلہ بھی ہو چکا تھا کہ اس گندم کی فروخت سے جو رقم حاصل ہو گی وہ ترقی کے منصوبوں پر خرچ کی جائے گی۔ پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کے وارث ملک آج پسماندہ ہیں۔ انہیں اپنی آزادی کے سوا سب کچھ بھول کر ترقی کرنا چاہیے۔ آزادی کو اس لئے یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ چھوئی موئی کے پتوں کی طرح نازک ہوتی ہے۔ اسے کسی بے احتیاط ہاتھ کی ہوا لگی اور وہ کملائے' اس کے اردگرد بڑے بڑے ہتھیاروں اور سخت قوانین کی باڑھ ہر وقت باندھے رکھنا چاہیے۔ ترقی اور آزادی کی حفاظت دو ایسے مقاصد ہیں کہ ان کی خاطر بہت سے لوگوں کو ادھ ننگا بھی پھرنا پڑے تو پھریں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ کچھ دیر ننگا رہنا بھی صحت کے لئے مفید ہے پاؤں کی تلیاں بھی پھیپھڑوں کی طرح سانس لیتی ہیں۔

قوم کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس پر آنے والی نسلوں کا بھی بڑا حق ہے' موجودہ نسلیں چاہے مر مر کے جئیں لیکن آنے والی نسلوں

کا حق ایک مقدس فریضے کی طرح ادا کریں کہ ان بیچاریوں نے تو ابھی آنکھ بھی نہیں کھولی۔ ان کی روحوں کے لئے تو ابھی جسم بھی بننا شروع نہیں ہوئے' وہ تو یتیم اور یسیر ہیں۔ ان کی نہ کوئی ماں ہے اور نہ کوئی باپ۔ قوم انہیں بھول سکتی ہے مگر سرکار انہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ یتیموں اور بے زبانوں کا بڑا خیال رکھتی ہے۔

نمبردار کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ امدادی گندم کی فروخت کا صحیح حساب رکھے اس میں ذرا سی بھی گڑبڑ ہوئی تو باقی رقم مالیے کے طور پر وصول کی جائے گی۔ نمبردار کی اپنی حالت بھی اندر سے پتلی ہو چکی تھی اور اس نے وہ لوگ بھی دیکھے تھے جو مالیہ اور دوسرے سرکاری واجبات وقت پر ادا نہیں کر سکے تھے' وہ تحصیل کی حوالات میں بند کر دیے جاتے تھے ٹکے ٹکے کے اہلکاران پر آوازے کستے تھے اور ان کے رقبے کوڑیوں کے مول نیلام ہو جاتے تھے۔ سرکار اور کچھ کرے یا نہ کرے' اپنے واجبات ڈنڈے کے زور سے وصول کرتی ہے۔ اگر وہ سختی نہ کرے تو اپنے ملازموں کو تنخواہ کہاں سے دے؟ وہی ملازم جو لوگوں پر حکم چلاتے ہیں اور سرکار کی آنکھ اور کان بننے کے علاوہ اس کے چابکدار بھی ہوتے ہیں۔ مالیے کا لفظ نمبردار کے لئے چابک بن گیا تھا۔ وہ فوراً اپنے گودام میں پہنچا تھا' ایک بوری گئی تھی' گودام کا دروازہ بند کر کے خود تالہ لگایا تھا۔ اس نے چوکیدار کے ساتھ اپنے دو خاص مزارعے بھی پہرے پر بٹھا دیئے تھے' وہ تینوں گودام کی دیواروں سے چھپکلیوں کی طرح چپک کر گھات لگائے بیٹھے تھے کہ گودام کے قریب سے کوئی بھنگا بھی گزرتا تو اسے جھپٹ لیتے۔

مہرو کو حساب کتاب سے کوئی غرض نہیں تھی' وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ اس کا چھوٹا بیٹا نمبردار کے پوتے سے پوچھ رہا تھا' کیا تمہارے گھر میں روٹی پکتی ہے؟

نمبردار کی بیٹھک سے وہ بڑا افسر ہو کر نکلا تھا اسے ہر طرف لاغر بچے اور ڈولتی ہوئی مسلن نظر آ رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں اماوس کی گدلی شام کی طرح خالی تھیں' نہ سورج' نہ چاند اور کوئی تارا' اس کے سامنے گاؤں کا گاؤں قبرستان بن گیا تھا۔ اونچی نیچی قبریں' کچی پکی قبریں' نئی پرانی قبریں۔

بھوک کی یلغار سے پہلے کسی کی موت پر تعزیت کرنے والے آتے تھے تو سلام دعا کے بعد کہتے تھے۔

''مولا کی مرضی۔''

سوگوار جواب دیتے تھے۔

مان کے بیٹھے ہیں۔

پھر ادھر ادھر کی باتیں چل نکلتی تھیں مگر اب یہ دو جامع جملے ناکافی لگنے لگے تھے' ان کے بعد کہنے کے لئے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ مرنے والے کے بعد مرنے والے بھی تنگ اور تیار پڑے ہوتے تھے۔ بولنے کے لئے اب صرف مہرو رہ گیا تھا اور وہ بھی بین کرتے ہوئے جملے بولنے لگا تھا۔ اس کی باتیں سن کر لمبے تڑنگے مرد بھی آنسوؤں سے رونے لگتے تھے۔ اس نے یہ جملے کئی محفلوں میں دہرائے تھے کہ موت بڑی بھیانک چیز ہے' اپنی نہیں' اپنے پیاروں کی' اپنی موت تو امید کی چادر میں لپٹی رہتی ہے۔ یہ چادر چاک ہوتی ہے تو کفن سلنے لگتا ہے' مرنے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب سدا کے لئے سو گیا۔ اس کے سرہانے کھڑے ہوئے طبیب اور تیماردار اپنی زبانیں بند رکھیں تو وہ ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی موت کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے مگر اپنے پیاروں کی موت تو دکھائی دیتی ہے' دل پکڑ لیتی ہے' سوئیاں چبھوتی ہے' باندھ کر بے بس کر دیتی ہے۔ آدمی کے اختیار میں ہو تو وہ خود مر جائے' اپنے کسی پیارے کو مرتا ہوا نہ دیکھے۔

گھر جاتے ہوئے آج اسے اپنی ہی باتیں ستا رہی تھیں' اسکی حالت بھوکے مگر پر کٹے عقاب کی سی تھی جو دوڑنے میں خرگوش کا مقابلہ نہیں کر سکتا اسے نمبردار کے گودام میں بند گندم کی بوریاں' پریاں لگنے لگی تھیں اور اس کے پہرے دار دیوزاد دکھائی دیتے تھے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کلہاڑی لے کر ان دیوزادوں پر حملہ کر دے اور ان کے ٹکڑے کر کے گندمی پریاں آزاد کرا لے' مگر سوچنا آسان تھا اور کرنا بہت مشکل' نمبردار کا گودام تو اس کے لئے سمندر پر تیرتے ہوئے جہازوں سے بھی زیادہ دور ہو گیا تھا۔

مجبوری اور بے بسی اس کی ٹانگیں سن کر رہی تھیں۔ اس کے پاؤں آگے بڑھنے سے انکار کر رہے تھے چڑیا بھی اپنی چونچ میں چوگا لے کر اپنے بچوں کے پاس جاتی ہے' میں کیا منہ لے کر اپنے بچوں کے پاس جا رہا ہوں؟ یہ سوال اس کے سامنے ایک اونچی کالی فصیل بن گیا تھا اتنے میں کسی نے اس کا نام پکارا تھا تو اس کے قدم وہیں جم کر رہ گئے تھے' اسے عجیب سا سکون ملا تھا' شاید اس خیال سے کہ وہ کچھ دیر اور اپنے گھر سے دور رہ سکتا ہے یا اس امید سے کہ نمبردار نے سفارش کی ہوگی اور گورے صاحب نے اس پر ترس کھا کر حکم دیا ہوگا کہ اس غریب لنگڑے کی جھولی میں چار دانے ڈال دیئے جائیں' وہ پکارنے والے کی آواز کی سیدھ میں واپس لوٹ گیا تھا۔

نمبردار کی بیٹھک سے وہ دوسری مرتبہ نکلا تھا تو اس کے ذہن کے پردوں پر کئی چہروں کے سائے گھوم رہے تھے' نمبردار کا گیلا چہرہ' بڑے صاحب کا تحکمانہ چہرہ' گورے صاحب کا چور چہرہ' مسلن کا حیران چہرہ' اپنی بیٹی کا معصوم چہرہ' اپنے بیٹے کا بھوکا چہرہ اور بہت سے ہنستے کٹیلے' مستغیث اور مفتی چہرے۔ سارے چہروں کے سائے مل کر ایک سایہ بن گئے تھے' رات سے بھی بڑا' ستاروں نے اپنے مورچوں سے روشنی کے تیر چلائے تھے اور رات کی ڈھال چھلنی ہو گئی تھی مگر نہ صرف روشنی تھی اور نہ صرف اندھیرا' دونو ایک

دوسرے پر غلبہ پانے اور نمبردار کے گودام تک پہنچنے کے لیے لڑ رہے تھے' اس وقت اگر کوئی دیکھ سکتا تو دیکھتا کہ چار پانچ انچ لمبی گردن پر لٹکا ہوا سات آٹھ انچ اونچا سر کتنا وسیع و عریض میدان جنگ بن سکتا ہے۔

گھر پہنچتے پہنچتے مہرو کو معلوم ہو گیا تھا کہ میدان کس کے ہاتھ رہا؟ کون مجروح ہوا اور مال غنیمت کون لے گیا؟ وہ لنگڑا بیربل یہ نہیں جانتا تھا کہ چٹیل پہاڑی کی ڈھلان پر پاؤں پھسل جائے تو وہ پہاڑی کے دامن میں جا کر رکتا ہے' سنگریزے تو زخمی نہیں ہوتے صرف اپنی جگہ بدل لیتے ہیں مگر پھسلنے والے آدمی کا جسم لہولہان اور لباس تار تار ہو جاتا ہے' وہ پلٹ کر اس پہاڑی کو دیکھتا ہے تو رات کی روشنی میں وہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی سے بھی اونچی لگتی ہے۔

محنت کبھی مہرو کی تفریح ہوتی تھی لیکن اب اس کا جسم آرام کی افیون کا عادی ہو گیا تھا' مفت کی روٹی اس کے منہ کو لگ گئی تھی اس میں صرف ایک ہی پرانی صفت باقی رہ گئی تھی' وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنے وعدے کا کھرا تھا۔

آج رات بھی وہ تاروں کی چھاؤں میں اپنی کراہتی ہوئی بیٹی کو ساتھ لایا تھا' دروازہ کھلا تو وہ چور نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے چپ چاپ واپس نہیں گیا وہیں سر جھکائے ہوئے کھڑا رہا' دروازہ حیرت سے منہ پھاڑے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا اسے آج ذرا جلدی لوٹا دیجیے گا کل بھی دیر ہو گئی تھی۔ ماں نے بیچاری کو بہت مارا' کہتی تھی کہ کسی نے دیکھ لیا تو بنی بنائی عزت مٹی میں مل جائے گی۔

◆◆◆

بابل کے گھر کی چڑیا

میاں صاحب کھاتے پیتے آدمی تھے' آخر افسر تھے مگر سب جانتے تھے کہ وہ تنخواہ کے غلام ہیں' اسی میں گزر بسر کرتے ہیں کسی میں ہمت نہیں تھی کہ عید بقر عید پر سیر بھر مٹھائی بھی ان کے گھر لے جائے' پھر بھی لوگوں کو ان کا عہدہ اور ان کا محکمہ برابر دھوکہ دیتا رہتا تھا۔ چور کا بھائی کتنا ہی سادھو ہو' اپنی ذات رات کی مجبوری سے چھوٹا موٹا گٹھ کترا تو ضرور ہوگا' میاں صاحب کبھی کبھار جب موڈ میں ہوتے تو بیگم کو چھیڑتے' جب کوئی مانتا ہی نہیں کہ ہمارے محکمے میں بھی کوئی ایماندار رہ سکتا ہے تو پھر ہم کیوں اپنے کپڑے سمیٹ کر ایک طرف بیٹھے رہیں۔ بہتی گنگا ہے' اس میں ذرا سے ہاتھ گیلے کر لیں' بیگم جواب میں مسکرا دیتی' اسے معلوم تھا کہ میاں صاحب اپنے سوال کا جواب خود ہی دیں گے اسے تو یہ جملے رٹ گئے تھے کہ ہم لے دے کے کل تین جی ہیں' خدا ساری ضرورتیں پوری کر رہا ہے' پھر کیوں چور بنیں اپنے ضمیر کے سامنے؟ کیوں خراب کریں اپنی اے۔سی۔آر (کارکردگی کی سالانہ رپورٹ) اللہ میاں کے دربار میں۔

تیسرا جی نسرین تھی' میاں صاحب کی واحد اولاد' ان کی شادی کے دس برس بعد پیدا ہوئی تھی' پکی عمر کی نکٹی چپٹی اولاد بھی ماں باپ کو بہت پیاری ہوتی ہے اور نسرین تو خوبصورت بھی اور ذہین بھی۔ اس نے بروقت پیدا ہو کر اپنی ماں پر بڑا احسان کیا تھا۔ اللہ بخشے بڑے میاں صاحب کو' ان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا۔ وہ دبے لفظوں میں کہنے لگے تھے کہ اپنے بیٹے کی دوسری شادی کریں گے' نسل تو قائم رہے' اپنے بزرگوں کی قبر پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا ہو' نسرین نے پیٹ میں آ کر انکی زبان کو دعاؤں پر لگا دیا تھا' پوری کی پوری دعا کب پوری ہوتی ہے ایک آدھ آنچ کی کسر ہمیشہ رہ جاتی ہے' اگر پوری کی پوری دعائیں قبول ہو جائیں تو انسان تو بالکل آزاد ہو جائے' آخر کتنی دعائیں ہوتی ہیں یہی نو یا دس! نسرین نے پیدا ہو کر یہ تو ثابت کر دیا تھا کہ ایک دن پوتا بھی آ جائے گا لیکن مرکب انتظار کا ساتھ دیتی ہے۔ بڑے میاں صاحب پوتا مانگتے ہی رہ گئے اور اللہ کے دربار سے ان کا بلاوا آ گیا۔

نسرین کے پیدا ہوتے ہی میاں صاحب کے گھر میں بہار آ گئی' سوکھے ٹھنٹھ پر بھی کونپلیں پھوٹنے لگیں' نسرین نسرین کر کے میاں صاحب کا حلق خشک ہو جاتا' وہ ہر دم پروانے کی طرح اس کے اردگرد گھومتے رہتے۔ اسی کی وجہ سے میاں صاحب نے اپنے مشفق باپ کی رحلت کا صدمہ بھی آسانی سے برداشت کر لیا تھا۔ ایک دو دن بجھے بجھے سے رہے پھر نسرین کے ساتھ مل کر قہقہے لگانے لگے

جوں جوں دن اور مہینے گزرتے گئے۔ میاں صاحب کا پیار بڑھتا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں دنیا میں صرف دو ہی کام ہیں' دفتر جانا اور نسرین کا دل بہلانا' بیگم کو تو وہ بھول ہی گئے تھے۔ وہ بیچاری صرف اس وقت یاد آتی' جب کوئی چیز ڈھونڈے سے نہ ملتی' نسرین سکول جانے کے لئے وقت پر تیار نہ ہوتی یا دفتر میں ان کی کسی چیز ہو جاتی۔ ان کا باقی وقت نسرین کی چمکتی آنکھوں' ننھے منے ہاتھوں' سرخ وسفید گالوں' کالے سیاہ بالوں اور مسکراتے ہوئے سوالوں میں گزرتا۔ کبھی کبھی بیگم' نسرین سے چڑ جاتی کہ میاں صاحب نے اس کے حصے کی توجہ بھی نسرین کے نام لکھ دی ہے پھر سوچتی کہ نسرین مجھ سے الگ تو نہیں ہے میری ہی بیٹی ہے' میرا ہی خون ہے۔

نسرین کا بچپن تو جیسے آنکھ کی ایک جھپکی میں گزر گیا۔ وہ سکول سے کالج میں پہنچ گئی۔ میاں صاحب جہاں تھے وہیں کھڑے رہے' وہ نسرین کو ابھی تک پھول سی بچی سمجھتے تھے' جسے تیز ہوا اور تیز دھوپ سے بچانا ان کا فرض تھا۔ بیگم کبھی کبھی حیران ہوتی کہ میاں صاحب کی آنکھوں کو کیا ہو گیا کہ جوان جہان لڑکی کو انگلی پکڑ کر چلنے والی بچی سمجھتے ہیں۔ بیگم نے ایک دو بار دبے لفظوں میں نسرین کی شادی کا ذکر چھیڑا تو میاں صاحب بگڑ اٹھے' ہو جائے گی شادی بھی' سب کی ہو جاتی ہے' لولے لنگڑوں کی بھی ہو جاتی ہے۔ نسرین کی ابھی عمر ہی کیا ہے' اسے اپنی تعلیم تو مکمل کر لینے دو۔ میاں صاحب دراصل یہ سوچ کر ہی خوفزدہ ہو جاتے تھے کہ نسرین اس گھر سے جا بھی سکتی ہے' وہ چلی گئی تو باقی کیا رہ جائے گا' جھاڑ جھنکاڑ! وہ گھر کی روشنی ہی نہیں تھی' انکا تو گھر تھی۔

بیگم پر بلڈ پریشر کا حملہ ہوا تو اسے ہر طرف موت خاک اڑاتی نظر آنے لگی' حملہ ایسا شدید تھا کہ ڈاکٹروں کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بلڈ پریشر دیکھتے تو ایسا لگتا کہ پارہ شیشہ توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ ایسے میں اگر کوئی نس پھٹ گئی تو فالج گر سکتا ہے' سکتہ طاری ہو سکتا ہے' موت واقع ہو سکتی ہے۔ ایک عرصے کے بعد میاں صاحب اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ نسرین تو بس ان کے گلے کا ہار ہے۔ ماں کو تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ نسرین کی یہ بات انہیں بری لگی۔ مگر اس کے اظہار کا یہ موقع نہیں تھا اور پھر بیگم نے مہلت کہاں دی؟ طبیعت ذرا سنبھلی تو اس نے نسرین کی شادی کی رٹ لگا دی' میاں صاحب اب تو بگڑ کر جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اگر اس وقت بیگم کے ہاتھ میں کوئی رشتہ ہوتا تو اپنی بیماری سے فائدہ اٹھا سکتی تھی مگر میاں صاحب تو ''ان سوشل'' اور اکھل کھرے مشہور تھے اور ساتھ ہی دیانتدار بھی ان کے ہاں نہ عزیزوں میں سے کوئی رشتہ آیا اور نہ غیروں میں سے ہی کسی نے پیغام بھیجا۔ نسرین خوبصورت اور ہنس مکھ اور کلچرڈ تھی۔ اگر شادی صرف لڑکے اور لڑکی کا معاملہ ہوتی تو وہ گھر سے کب کی رخصت ہو چکی ہوتی مگر معاشرے پر تو ابھی پرانے خیالات راج کرتے تھے' شادی دو خاندانوں میں ایک رشتہ سمجھی جاتی تھی اور میاں صاحب سے کوئی بھی رشتہ جوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

ماں کی علالت کے بعد نسرین کو بھی رہ رہ کے غصہ آنے لگا تھا' آخر ماں اور باپ اس کی شادی کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟ کیا اسے بٹھائے بٹھائے بوڑھا کر دیں گے؟ اس کی اکثر سہیلیوں کی شادی ہو چکی تھی' دو تین تو گود میں بچے لئے پھرتی تھیں' وہ سب اس طرح خوش تھیں جیسے جنت میں رہ رہی ہوں' نسرین کو بھی ماں باپ کی محبت کے علاوہ بہت کچھ چاہیے تھا' اپنا گھر' اپنا شوہر' اپنا بچہ' جب سے بیگم نے میاں صاحب کو مجبور کر کے اس کا بستر دوسرے کمرے میں لگوایا تھا وہ اور زیادہ تنہا ہو گئی تھی' اسے ماں باپ کا جوڑا بھی بری طرح کھلنے لگا تھا۔ میاں صاحب اور بیگم ہر وقت اس پر قربان ہوتے رہتے تھے مگر ان کا پیار دلار اس کی شاموں کی ویرانی تو دور نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی راتیں تو پردوں' دیواروں اور چھت کو گھورنے سے ہی شروع ہوتی تھیں اور پڑھائی سے تنگ آ گئی تھی۔ کورس کی کتابیں اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں۔ وہ الم غلم کتابیں پڑھتے پڑھتے سو جاتی تھی اور کوہ قاف کی ان پریوں کے خواب دیکھتی تھی جو الگ الگ پنجروں میں چڑیوں کی طرح بند تھیں۔ ہر روز ایک شہزادہ آتا اور ایک پری کو آزاد کرا کے لے جاتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ساری پریاں اس کی ہم شکل تھیں۔

شہلا بھی نسرین کی پرانی سہیلی تھی۔ ایک دن وہ اپنے بھائی سلمان کو لے کر بیگم کی مزاج پرسی کے لئے آئی بیگم شاید کچھ بھی نہ سمجھتی مگر بار بار بلانے کے باوجود نسرین جب اپنے کمرے سے نہ نکلی تو بیگم نے چونک کر سلمان کو دیکھا اور وہ اسے پسند آیا۔ شہلا کو لے کر وہ دوسرے کمرے میں گئی تو اس نے نسرین اور سلمان کے دل کی بات بتا دی۔ بیگم کا بلڈ پریشر گر کر خود بخود نارمل ہو گیا۔ بیٹی نے ایک اور مشکل بھی آسان کر دی تھی پہلے سوت سے بچایا اور اب رشتہ ڈھونڈھنے سے' مگر میاں صاحب پچھلے پہر کے سائے کی طرح اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی معصوم سی چڑیا خود ہی اپنا رشتہ جوڑ کر فائل کی طرح ان کی میز پر رکھ دے گی بیگم نے شہلا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا دیکھو بیٹی! اگر اس بات کی بھنک بھی میاں صاحب کے کان میں پڑ گئی تو قیامت آ جائے گی' اس لئے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لینا ہو گا۔

بیگم اور نسرین کی ہدایات اتنی مکمل تھیں کہ میاں صاحب کے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اپنے منہ سے کئی بار سلمان کی تعریف کر چکے تھے۔ اس کے خیالات انہیں بڑے پاکیزہ لگتے تھے۔ وہ دل سے ان کی دیانتداری کی قدر کرتا تھا۔ اسی لئے تو کہتا تھا کہ آپ جیسے سوچ اس بھی دیانتدار افسر ہوں تو بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوں' مسائل ہوتے کم ہیں اور بنائے زیادہ جاتے ہیں تاکہ مٹھی گرم ہوتی رہے۔ انہیں سلمان کے والدین بھی پسند تھے اور شہلا کو تو وہ دوسری نسرین سمجھنے لگے تھے۔ رشتے کی بات چلی تو میاں صاحب انکار نہ کر سکے۔ سلمان کے والدین نے یہ کہہ کر تو انہیں جیسے خرید لیا کہ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ نسرین ایسی بیٹی

ہمارے گھر آجائے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔ اب میاں کی ایک شرط تھی' پہلے نسرین اپنی تعلیم مکمل کرے گی' پھر شادی ہوگی' جواب میں انہیں بھی یہ درخواست قبول کرنا پڑی کہ انگوٹھی پہنانے کی رسم ہو جائے تو سب لوگوں کو اس رشتے کا علم ہو جائے گا' دونوں گھروں میں کنکر آنے بند ہو جائیں گے۔ بیریاں صرف لڑکی والوں کے گھروں میں نہیں اگتیں' لڑکے والوں کے ہاں بھی پھیلتی ہیں۔

منگنی کی تقریب میں سادگی کے سوا سب کچھ تھا۔ میاں صاحب بیمار بیگم کی بات ماننے پر مجبور تھے اور بیگم کو سلمان کے گھر والوں نے دھوم دھڑکے کی پٹی پڑھائی تھی تاکہ شریکوں کی زبانیں گنگ ہو جائیں انگوٹھیوں کا تبادلہ ہوا تو دونوں میں ہیرے جڑے تھے' یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس کا ہیرا زیادہ قیمتی ہے۔ جانچنے پرکھنے والوں نے نسرین اور سلمان کی انگلیاں چھیل ڈالیں۔ میاں صاحب سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ تو یہ بھی بھول گئے تھے کہ کس بات کی مبارکباد وصول کر رہے ہیں! بس ریکارڈ کی طرح بجے چلے جا رہے تھے۔ صرف یہ سوال رہ رہ کر ان کے دماغ پر ٹھونگیں مارتا تھا کہ تو ماشے کی انگوٹھی میں وہ کونسا جادو بھرا ہے کہ نسرین اتنے پیار سے سلمان کو دیکھنے لگی ہے' دونوں کی نظریں ملتی ہیں تو اس کے چہرے پر گلال پھر جاتا ہے؟

منگنی کے بعد دونوں گھر ایک دوسرے میں اس طرح سما گئے' جیسے ایک ہی کنبہ ہوں' نسرین ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور سلمان اپنے باپ کا اکلوتا وارث' ان کے گھروں میں دوئی رکھنا بے کار تھا۔ کچھ دن گزر تو سلمان کے والدین نے شادی کی بات چھیڑی' میاں صاحب نے انہیں اپنی شرط یاد دلا کر خاموش کر دیا' شرط تو انہیں بھی یاد تھی مگر وہ حیران تھے کہ نسرین کے امتحان میں چار پانچ مہینے باقی ہیں اور میاں صاحب کے گھر میں کوئی نئی چیز نہیں آئی۔ وہ میاں صاحب کو احساس دلانا چاہتے تھے کہ انہیں بیٹی بیاہنا ہے اور وہ تین کپڑوں میں بیٹی کو رخصت نہیں کر سکتے۔ ایک دن وہ لوگ گئے تو میاں صاحب نے پریشان ہو کر کہا ''بیگم یہ لوگ نصیب صاحب کی بیٹی کے جہیز کے بارے میں اس قدر نکھار نکھار کے باتیں کیوں کر رہے تھے؟''

''شادی میں شریک ہو کے آئے تھے۔ دولہا' بارات اور جہیز کی بات ہی کرنا تھی۔''

اس وقت تو میاں صاحب مطمئن ہو گئے' مگر سلمان کے والدین کا تو معمول بن گیا تھا کہ شہر میں ہونے والی ہر شادی میں شریک ہوں گے' واپسی پر میاں صاحب کو سلام کرنے ضرور حاضر ہوں گے۔ گھما پھرا کر بات جہیز پر لے آئیں گے اور پھر کپڑوں اور زیور سے لے کر کراکری' فرنیچر اور قالین تک ہر شے کی تفصیل بتائیں گے انہیں شاید یقین ہو چکا تھا کہ میاں صاحب بھولے بادشاہ ہیں' خشکی میں ناؤ نہیں چلتی' اسے گھسیٹ کر پانی تک لے جانا ہوگا' مگر میاں صاحب ایسے سادہ لوح بھی نہیں تھے کہ اشارے نہ سمجھ سکیں۔ انہوں نے زندگی بھر آدمی ہی چرائے تھے مگر اس معاملے میں ان کو روتی تھی اس لئے کام کی بات ٹال جاتے تھے۔

ایک روز ان سے رہا نہ گیا' انہوں نے بیگم سے صاف صاف کہہ دیا یہ لوگ جہیز کا ذکر یونہی نہیں کرتے' وہ ہمیں جہیز کی فہرست دیتے ہیں۔

ہماری ایک ہی تو بیٹی ہے' ہم جو کچھ دے سکتے ہیں ضرور دیں گے۔

ہماری بساط کے بارے میں ان کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔

آپ تو یونہی بیٹھے پرکا کوا بناتے رہتے ہیں' دیکھیں تو نسرین کتنی خوش ہے؟

یہی تو مشکل ہے' نسرین اور سلمان ایک دوسرے کو اتنا پسند کرنے لگے ہیں کہ انہیں جدا کرنا آسان نہیں ہے۔

جدا ہوں' ان کے دشمن بیگم چمک کر بولی وہ میاں صاحب کی ہٹ دھرمی اور فیصلوں سے ہمیشہ ڈرتی رہتی تھی۔ سلمان کے ماں باپ نے جہیز کا زیادہ لالچ کیا تو سلمان انہیں روک دے گا۔

خاک روکے گا' دیکھا نہیں تھا' وہ بھی ماں باپ کا ساتھ دے رہا تھا تم نہیں جانتیں ان تاجر بچوں کو جو کوئی ان کے ہاتھ چڑھ جائے' اس کا سر کورے استرے سے مونڈ دیتے ہیں' بارات سے پہلے ٹرک آئیں گے' جہیز سمیٹنے۔

بس بھی کریں' آپ کے دل پر تو ہمیشہ شبہ سوار رہتا ہے' آپ کی سوچ بھی دفتری ہو گئی ہے۔ آپ کے دفتری معاملات نے میری زندگی تو چورا کر دی' اب بیٹی کی شادی کو تو دفتر کا معاملہ نہ بنائیں۔ آپ تو سارے محکمے میں مشہور' ہر کام میں کیڑے نکالنے والے۔

میاں صاحب نے زندگی میں پہلی بار بیگم کی اونچی آواز سنی تھی اور وہ بھی الزام دیتی ہوئی' وہ حیران تو ہوئے مگر مصلحتاً بلکہ عادتاً دب گئے انہوں نے تو کبھی کسی چپڑاسی کو بھی جھاڑ نہیں پلائی تھی' جو کچھ بھی کرتے تھے' قلم سے کرتے تھے۔

شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو' میں کچھ زیادہ ہی وہمی ہوں' مگر میری بات یاد رکھنا' انہوں نے وہ بات چپکے سے نگل لی' جو ان کے دل میں یقین کی طرح گھر کر چکی تھی۔

میاں صاحب کی ریٹائرمنٹ میں دو تین سال باقی تھے' انہیں آسانی سے ایکسٹینشن بھی مل سکتی تھی۔ ان جیسے عجیب الخلقت لوگ اب کہاں ملتے ہیں جو پورے محکمے کی عزت کے رکھوالے ہوں' جن کا نام لے کر دوسرے افسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالا جائے اور جن کے ہاتھ محکمے کے نام کی تختی کو چمکانے میں مصروف رہیں۔ لوگ بے شک انہیں اس طرح دیکھیں جس طرح بچے چڑیا گھر میں کوئی انوکھا جانور دیکھتے ہیں وہ بھی تھوڑی دیر کو بھول ہی جاتے ہیں کہ چڑیا گھر میں اور بھی جانور ہیں' بڑے بڑے خونخوار درندے یہی وجہ تھی کہ میاں صاحب نے جب قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست بھیجی تو افسر اعلیٰ اپنے کمرے سے اٹھ کر انہیں سمجھانے آیا۔

دوسروں افسروں نے ان کا فیصلہ بدلنے کی کوشش کی بیگم نے بھی مشورہ دیا کہ نسرین کی شادی کے ریٹائرمنٹ نے لے لیجئے گا۔آپ کرسی پر ہوں گے تو بارات کا استقبال کرنے کے لئے چار چار افسر بھی آ جائیں گے۔مگر میاں صاحب اگر کسی بات پر اڑ جاتے تو اشوک کی لاٹھ بن جاتے۔انہوں نے ریٹائرمنٹ سے پہلے تمام مراعات کے ساتھ سب کو ملتی تھی۔وہ جس روز عینک اتار کر دفتر سے نکلے تھے۔اسی دن سے ریٹائرڈ تھے۔انہوں نے چونکہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔اس لئے آدھی پنشن بھی کمیوٹ ہوگئی اور دوسرے تھے۔ انہوں نے چونکہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔اس لئے آدھی پنشن بھی کمیوٹ ہوگئی اور دوسرے واجبات بھی مل گئے۔وہ آخری چیک لے کر گھر آئے تو نسرین کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا لڑکے والوں کی بات مان لی اور شادی کی تاریخ پکی کر دی۔

شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں تو میاں صاحب نے جیسے خزانے کا منہ کھول دیا' انہوں نے گن گن کر ہر وہ چیز خریدی جس کے بغیر جہیز مکمل نہیں ہوتا تھا' ان کے پاس اشیاء کی فہرست تھی' قیمتوں کا حساب نہیں تھا۔وہ چیک پر چیک کاٹے چلے جا رہے تھے تاکہ سلمان کے والدین کے لالچ کا منہ بھر دیں۔انہوں نے نسرین کی ہر فرمائش پوری کی' جو باپ کی دریا دلی دیکھ کے کچھ زیادہ ہی اینٹھ گئی تھی۔بیگم نے زندگی میں پہلی بار میاں صاحب کا ہاتھ کھلا دیکھا تو حیران رہ گئی' وہ تو پیسے کو دانتوں سے پکڑتے تھے' ضروری خریداری بھی مہینوں ٹالتے رہتے تھے' ایک دم ایسے دریا دل کیسے ہوگئے؟ اس نے ایک آدھ بار ٹوکا بھی' پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ میاں صاحب محتاط آدمی ہیں' پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں' دیکھ بھال کر ہی خرچ کر رہے ہوں گے۔ان دنوں وہ صرف ایک بار ذرا سے ناراض ہوئے' بیٹی نے ماتھا پٹی کی فرمائش کی تو انہیں معلوم ہوا کہ بیگم نے اپنی ماتھا پٹی بیچ کر اس کی رقم منگنی کی انگوٹھی میں ملا دی تھی اور وہ انگوٹھی اب سلمان کی انگلی میں پھنسی ہوئی تھی۔میاں صاحب کو بیگم کی اس حرکت سے سخت صدمہ پہنچا تھا' چوری کی بات الگ تھی' وہ ماتھا پٹی میاں صاحب کی مرحوم ماں نے اپنی بہو کو گھر میں پہلا قدم رکھنے پر تحفے میں دی تھی' اس لئے بڑی قیمتی تھی۔

شادی ایسی دھوم دھام سے ہوئی کہ میاں صاحب کو جاننے والے بھی لوگ حیران رہ گئے۔گھر میں تین دن تک جہیز سجا رہا تاکہ سلمان کے والدین اپنی آنکھیں خوب ٹھنڈی کر لیں۔

میاں صاحب ایماندار ہیں یا نہیں' یہ تو اللہ ہی جانتا ہے مگر دور اندیش ضرور ہیں' ریٹائرمنٹ نہ لیتے تو انکوائری ہو جاتی۔

میاں صاحب جن کرسیوں پر بیٹھے ہیں ان کی گدیوں میں نوٹ بھرے ہوتے تھے' وہ اپنی بیٹی کو سونے میں بھی تول دیتے تو کم تھے۔

جتنے منہ اتنی باتیں! میاں صاحب گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے' ہمیشہ اپنے کام سے ہی کام رکھا تھا۔لوگوں کی باتیں نہ کبھی پہلے تک

پہنچی تھیں اور نہ اب پہنچ پائیں' بہرے لوگ اسی لئے تو اچھے ہوتے ہیں کہ لوگ انہیں چپکے سے گالی دے کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں اور انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔

بیٹی کو رخصت کرنے کے بعد میاں صاحب بھیگی ہوئی آنکھوں سے پلٹ کر گھر کو دیکھا تو انہیں یوں لگا جیسے نادر شاہ کی فوج ابھی ابھی یہاں سے گزر گئی ہے۔ پھر بھی وہ خوش تھے کہ اپنے سب سے بڑے فرض سے سبکدوش ہو گئے' آخر اسی دن کے لئے تو انہوں نے ریٹائرمنٹ لی تھی اور اپنی آدھی کمیوٹ کرائی تھی۔

شادی کے ہنگاموں اور بیٹی کی وداعی نے بیگم کو چکنا چور کر دیا۔ اس کا بلڈ پریشر بلیوں اچھلنے لگا۔ اس وقت میاں صاحب کو یاد آیا کہ گھر میں صرف دو بندے نہیں ہیں' تیسری بیماری بھی ہے' جس کا نام پیٹ کنواں ہے۔

صبح سویرے وہ بینک پہنچے کہ دیکھیں کتنی رقم بچی ہے۔ حساب کا پرچہ سامنے آیا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس پر گدھے لوٹ رہے تھے۔ شکر ہے کہ کرسی پر بیٹھے تھے' کھڑے ہوتے تو چکرا کر گر پڑتے۔ عینک کا شیشہ صاف کر کے اپنی چیک بک نکالی' ہر چیک کا نمبر ملایا' پیسہ پیسہ درست تھا۔

وہ اپنے آپ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے بینک کی عمارت سے نکلے' سامنے سڑک پر ایک ہجوم رواں دواں تھا' کاریں' بسیں' سکوٹر اور پیدل لوگ مگر انہیں صرف لال پیلے دھبے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے قدم اس طرح اٹھ رہے تھے جیسے وہ سمندر کے فرش پر چل رہے ہوں۔ پانی کے ایک ریلے نے انہیں ایک اندھی تاریک غار میں دھکیل دیا جس میں ہر طرف سانپ پھنکارتے پھرتے تھے۔ غار کی دیواریں ایک دوسرے سے مل گئیں اور انہیں ایسا لگا جیسے وہ ان میں زندہ چنے جا رہے ہیں' انہوں نے چیخنا چاہا مگر سمندر کی تہ سے کوئی آواز سطح تک نہیں پہنچ سکتی پتہ نہیں وہ کیسے غار کی دیواروں اور سمندر کی موجوں میں سے زندہ سلامت بچ کر نکل آئے۔

راستے میں ان پر بڑھاپے کا شدید حملہ ہوا۔ گھر پہنچتے پہنچتے ان کی چال ڈھال بدل گئی۔ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں نسرین کے کمرے میں گئے اور اس کے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں' پاس کے کمرے سے بیگم کے کراہنے کی آواز ابھرا اور ڈوب رہی تھی' ہر کراہ ان کے سینے پر نیزہ بن کر گرتی تھی اور سوال کرتی تھی' اب کیا ہو گا؟

وہ رات تک یونہی گم صم پڑے رہتے لیکن نوکرانی کی گھبرائی ہوئی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

صاحب اٹھیئے! بیگم صاحبہ بے ہوش ہو گئی ہیں۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھے تو سامنے نسرین اور سلمان کی منگنی کی تصویر مسکرا رہی تھی' وہ اس سے آنکھیں چرا کے بیگم کے کمرے میں پہنچے اور

بھاگ کر ڈاکٹر کو لے آئے۔اس نے ایک انجکشن لگایا اور تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔بس آرام کی ضرورت ہے۔ڈاکٹر کو فیس ادا کرتے ہوئے پہلی بار کا ہاتھ کانپا اور انگلیوں سے پھسلتے ہوئے نوٹ نے جیسے پلٹ کے پوچھا اب کیا ہوگا؟

بیگم ہوش میں آئی تو اس نے سب سے پہلے نسرین کا نام لیا۔میاں صاحب سامنے کھڑے تھے مگر وہ تو انہیں دیکھ ہی نہیں رہی تھی یا انہیں اس خالی شیشی کی طرح سمجھ رہی تھی جو سرہانے الٹی پڑی تھی۔میاں صاحب کے دل پر چرکا سا لگا' ان پر بیزاری کا دورہ پڑا۔ انہوں نے عمر بیگم کی رفاقت میں گلا کر گزار دی تھی مگر اب معلوم ہوا کہ مفت میں مٹی کھودتے رہے تھے' وہ اپنے آپ کو حقیر اور بیکار سمجھنے لگے' ریٹائر جو ہوگئے تھے' بیگم ان کے جذبات سے بالکل بے خبر تھی' اس کی آنکھوں میں صرف نسرین کی صورت اٹکی ہوئی تھی۔

وہ نسرین کو لانے کے لئے میاں صاحب سے اس طرح کہہ رہی تھی جیسے وہ کوچوان ہوں' ڈرائیور ہوں' کہار ہوں' وہ چڑ بھی گئے اور رنجیدہ بھی ہوگئے۔

آجائے گی' آجائے گی نسرین بھی' انہوں نے برے دل سے کہا اور کمرے سے نکل گئے۔بیگم کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہوگئے تھے۔وہ اسکی ضد پوری کرنا چاہتے تھے وہ خود بھی نسرین کو دیکھنا چاہتے تھے مگر سوچتے تھے کہ نسرین آئی بھی تو کیا کرے گی۔وہ تو اپنی ماں کو پانی کا ایک گلاس دینے سے پہلے چار بار نوکرانی کو آواز دیتی تھی۔اپنی ماں کی بیماری کو بھی ڈرامہ کہتی تھی جو دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اس نے رچا رکھا ہے۔وہ تو ماں کو مرتا دیکھے گی تو کلمے پڑھنے بیٹھ جائے گی کہ جلدی سے اس کی جان نکل جائے اور وہ اپنے گھر جائے۔ماں تو اس کے لئے فالتو سی چیز تھی۔مگر بیگم کے لئے وہ ان سے بھی زیادہ اہم کیسے ہوگئی؟ وہ تو اس قابل نہیں ہے' انہیں نسرین کے ارگرد خرابیاں برساتی بھنگوں کی طرح اڑتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

نسرین اب اکیلی کہاں آئے گی' اس کے ساتھ سلمان بھی آئے گا' شاید اس کے ماں باپ بھی اور ہوسکتا ہے کہ شہلا اور اس کا شوہر بھی۔ان کی خاطر مدارت پر ساٹھ ستر روپے اٹھ جائیں گے۔اتنی رقم میں تو بیگم کے لئے دوا آجائے گی۔اس وقت دوا زیادہ ضروری ہے۔وہ بڑبڑائے اور نسرین کو اطلاع کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ان کا دل' جو ذرا سا پسیجا تھا' اپنی اس حالت پر آگیا۔

انجکشن کا اثر ختم ہوا تو بیگم کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔میاں صاحب اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی ہمت بندھاتے رہے' اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتے رہے' ادھر ادھر قصے سناتے رہے مگر بیگم کی زبان پر تو نسرین کا نام چپک کر رہ گیا تھا' کسی طرح نسرین اور سلمان کو بلا دیجئے' میں انہیں ایک نظر دیکھ لوں تو میری طبیعت آپ ہی آپ سنبھل جائے گی۔اور میاں صاحب سوچ رہے تھے کہ ڈاکٹر کو بلائیں یا نہ بلائیں تسلی کے دو بول کہے گا ایک آدھ دوا بدلے گا اور سو روپے کا نوٹ گھسیٹ لے جائے گا' اس طرح

تو اگلے ماں کی پنشن بھی چند روز میں اڑ جائے گی، پھر کیا ہوگا؟

بیگم اب نسرین کا نام تیزی سے دہرا رہی تھی، اس کی التجا میں رقت بھی شامل ہوگئی تھی مگر میاں صاحب کو نسرین ڈاکٹر سے بھی زیادہ مہنگی لگ رہی تھی، انہیں نسرین کے ساتھ سلمان کا نام سوئی کی طرح چبھ رہا تھا۔ بیگم کی آواز مدھم پڑنے لگی، وہ اس کے قریب گئے، اس کے منہ سے ابھی تک نسرین کے نام کا فوارہ چھوٹ رہا تھا، وہ حرف حرف ہو کر ان کے کان میں گرتا تھا اور سیسے کی طرح جم جاتا تھا، دم بھر میں ان کا سر من بھر کا ہو گیا تھا۔

نسرین، نسرین، کون سی نسرین! وہ بابل کے گھر کی چڑیا، اب کچھ نہیں ہے میرے پاس اسے دینے کے لئے اسے کھلانے کے لئے، اسے بلانے کے لئے۔

بیگم کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ دیکھ کر ان کی برہمی اور بڑھ گئی، وہ تو مزے سے بیٹھی اپنا جہیز سجا رہی ہوگی۔ سلمان کے ساتھ مل کے قہقہے لگا رہی ہوگی اور میں سوچ رہا ہوں، تمہارا علاج کیسے ہوگا؟ یہ گھر کیسے چلے گا؟ سفید پوشی کس طرح قائم رہے گی؟ چھوڑو نسرین کو اس نے تو جوان ہونے کے سوا کوئی کام ہی نہیں کیا؟

بیگم گھبرا کر میاں صاحب کو گھورنے لگی، ان کا رنگ زرد تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے، کمرے میں خاموشی برف کے گالوں کی طرح گر رہی تھی۔ میاں صاحب کا سر آہستہ آہستہ جھکنے لگا، ان کے لبوں سے لفظ سسک سسک کر نکلے، زندگی تو سب کو اپنی اپنی ہی گزارنا ہوتی ہے نا، زینب بیگم، میں سوچتا ہوں، ہم بے اولاد ہی رہتے تو کل کی طرح آج بھی پرسوں ہوتے، چار پیسے تو پاس ہوتے، تمہارا علاج تو ٹھیک سے ہوتا رہتا، زندگی کے باقی دن بھی عزت سے گزار لیتے، مگر نسرین نے تو۔۔۔

انہوں نے نظریں اٹھا کر بیگم کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر خوف ناچ رہا تھا۔

◆◆◆

''پھلاں دے رنگ کالے''

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اکڑوں بیٹھ گیا' چھت کے ٹیڑھے سوراخ میں سے اترنے والی روشنی صبح کا اعلان کر رہی تھی۔ اس کے پپوٹے جل رہے تھے اور سر میں چکی چل رہی تھی۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی تو ذہن جھلاتے ہوئے باز کی طرح جھپٹے مارنے لگا۔ اچانک ایک واقعہ تیر بن کے اس کے دل میں ترازو ہو گیا' اسے اپنے آپ سے بھی شرم آنے لگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے غلیظ کمبل کا ایک کونا سرکایا' وہ ننگا نہیں تھا' اس نے سکون کا سانس لیا تو اس کی پسلیاں درد سے چیخنے لگیں۔

دو چہرے ایک دھماکے کے ساتھ اس کے ذہن میں گھوم گئے' پھر دو کے چار ہو گئے اور ان میں پانچواں بھی آملا' جو سب سے مکروہ صورت تھا۔ ان چہروں پر ایسی خشونت برس رہی تھی کہ اس نے کمبل کھینچ کے سر سے اوڑھ لیا کمبل کی اون سر پر سرسراتی تو اس نے گھبرا کر سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ پھسل کر اس کی گردن پر جا گرا۔ سر اور گردن سے ایک ساتھ ٹیسیں اٹھیں' اس کے سر کے بال غائب تھے میرے بال تو بڑے خوبصورت تھے' ہلکے گھنگریالے' تاجو کو بے حد پسند تھے مگر تاجو یہاں کہاں؟ تاجو کو یہاں نہیں آنا چاہیے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا' کوٹھڑی کے اندر صرف کالی دیواریں تھیں یا چیونٹیوں کی دو قطاریں جو کوٹھڑی کے کسی اندھے سوراخ سے آجا رہی تھیں' دو ٹیڑھی میڑھی زندہ کالی لکیریں' بے خوف اور بے خبر! اس کا جی چاہا کہ وہ بھی چیونٹی بن جائے اور اسی اندھے سوراخ سے باہر نکل جائے جو شاید ننھی سی چیونٹی کے برابر ہو گا انسان کا جی بھی کیا کچھ چاہتا ہے؟ کس کس پر رشک کرتا ہے۔

اسے شام والا بابا یاد آ گیا جو اس کے لئے دال اور چپاتیاں لایا تھا۔ وہ اسے گھور گھور کے یوں دیکھ رہا تھا' جیسے اسے کھانا دینے نہیں آیا' اسے کھانے آیا ہے۔ اس کی خشخشی کالی داڑھی میں سفید چاول چمک رہے تھے اس کی آنکھیں شاید دھوئیں سے لال ہو گئی تھیں میں تو بھوکا تھا' اس کے ہاتھ سے رکابی لے کر فوراً چپاتی کا نوالہ توڑا تو بابا کے چہرے کی سختی حیرت میں بدل گئی تھی' اس نے کہا تھا' بابو! تم شریف آدمی لگتے ہو' پہلے ہی دن کھانے لگے' یہاں تو جو آتا ہے' ایک دو دن منہ بناتا ہے بعد میں تو بھی کچے پکے چنے بھی ہاتھ سے چھیننے لگتے ہیں۔ بابا نے اپنی ٹوپی ذرا ٹیڑھی کی تھی مگر اس طرح تو وہ اور بوڑھا لگنے لگا تھا' اس نے جاتے ہوئے مشورہ دیا تھا' یہاں یہ مت کہنا کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ سب کچھ بتا دینا' سبھی بتا دیتے ہیں' یہاں کے افسر بڑے زہری ہیں۔ کئی کئی ولایتوں سے بات اگلوانے کے طریقے سیکھ کر آئے ہیں۔ یہ کوٹھڑی بھی انہوں نے اوپر کھڑے ہو کر بنوائی ہے' جبھی تو اس میں کھڑکی میں اور

روشندان نہیں ہے بس چھت میں وہ ٹیڑھا سا سوراخ ہے جو دن میں تارا بن جاتا ہے۔

اس نے بڑے بھولے پن سے وضاحت کی تھی کہ میں تو صرف ایک رات گزارنے آیا ہوں' بڑے صاحب مصروف تھے نا۔ بابا نے پلٹ کر کہا تھا بابو! یہاں کوئی ایک رات کے لئے نہیں آتا۔

اس نے چھوٹی چھوٹی لکیروں کو غور سے دیکھا جو دروازے کے ساتھ چیونٹیوں کی قطاروں کے اوپر دیوار پر کھینچی ہوئی تھیں۔ شام کو ایسا لگتا تھا کہ روغن اتر گیا ہے مگر اب تو ان میں سے کسی قیدی کی زندگی کے دن جھانک رہے تھے۔ قیدی چلا گیا تھا اور اپنی زندگی کے دن پیچھے چھوڑ گیا تھا کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آدمی چلا جائے اور اپنے پیچھے زندگی کے کچھ دن محفوظ کر جائے؟ جانے والا اتنے بہت سے دنوں کے بیلنے میں سے کیسے گزرا ہوگا؟ شاید اس نے اپنی زندگی کا ایک دن قصاب کے کندے پر رکھ کر چھری سے بوٹی بوٹی کیا ہوگا' ایک دن بہت سی لکیروں میں تبدیل ہوگیا ہوگا صبح' دوپہر' شام' رات یقیناً یہ اس کی زندگی کا طویل ترین دن ہوگا میرے لئے بھی تو یہ رات میری عمر سے بھی زیادہ لمبی ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ بھی یہ رات دیوار پر نقش کردے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا' وہاں تو کھرچنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی' جانے والا شاید اپنے ناخنوں سے دیوار چھیلتا رہا تھا۔

اس نے کمبل سے ہاتھ نکالا تو وہ نیلا پڑا ہوا تھا۔ قمیض کی آستین پھٹی ہوئی تھی' اس نے کپڑے کی چندیاں جوڑنے کی کوشش کی تو دوسرے بازو کے نیل بھی ننگے ہوگئے اسے اپنے بازوؤں سے زیادہ اپنی قمیض کا بازو دیکھ کے دکھ ہوا' اپنی سکالرشپ میں سے پیسہ پیسہ بچا کے اس نے چار ماہ میں یہ قمیض خریدی تھی۔ اب تو اسے وہی دو پرانی قمیضیں ہی پہننا پڑیں گی' جن کے رنگ بھی ڈھل گئے تھے۔ دوسرے طالب علم دور سے اس کی قمیض دیکھ کر ہی اسے پہچان لیتے تھے۔ اس کی صورت اور اس کے خدوخال پر اس کی پرانی قمیضیں حاوی ہوچکی تھیں۔

کاش مجھے مڈل میں وظیفہ نہ ملتا میں میٹرک ہی میں فیل ہوجاتا یونیورسٹی تک نہ پہنچ پاتا' میں شہر ہی نہ آیا ہوتا' اپنے باپ کا وہ بازو بن جاتا جو جنگ عظیم میں کٹ گیا تھا میں باپ کی جگہ ہل کی ہتھی پکڑ لیتا اور شام کو جب واپس آتا تو جو میری منتظر ہوئی' وہ تو مجھ سے محبت کرتی ہے' اسے میرے سرٹیفکیٹوں سے کوئی غرض نہیں ہے وہ تو گریجویٹ کا لفظ بھی ادا نہیں کرسکتی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی تو پاؤ پاؤ بھر کے ہونٹ اپنی جگہ جمے رہے' چلو ہل نہ چلاتا' سپاہی بھرتی ہوجاتا فوج میں پولیس میں اور وردی پہن کر گاؤں جاتا' وردی۔

مجھے کل دو باوردی شخص ہی تو یہاں لائے تھے۔ ایک کا قد لمبا تھا اور دوسرے کا ناٹا' عہدے میں چھوٹا بڑا تھا اور بڑا چھوٹا' لمبے قد والے کے ہر جملے میں ''سر'' کا لفظ ایک دو بار ضرور سر اٹھاتا تھا۔ ناٹے قد والے نے یقین سے کہا تھا' معمولی سی تفتیش ہے' تھوڑی دیر

میں واپس چھوڑ جائیں گے' ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے اسے رخصت کرتے ہوئے سفارش کی تھی' بڑا اچھا لڑکا ہے۔ بس اپنی پڑھائی سے کام رکھتا ہے ہر کلاس میں اول آتا ہے۔ شاید سپرنٹنڈنٹ کو بھی وہ بات معلوم نہیں تھی جو مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہے مگر اس کا رنگ زرد کیوں تھا؟ اس کی سفارش میں لجاجت کیوں تھی؟

اب اس کے ذہن کی دھند دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی۔ رات کے واقعات درختوں اور پہاڑوں کی طرح ایک شکل اختیار کر رہے تھے۔ مجھے جب اس کوٹھڑی کی طرف لایا جا رہا تھا تو راستے میں دو رویہ بارکیں تھیں' ہر کوٹھڑی کی سلاخوں میں ایک ایک چہرہ لٹک رہا تھا۔ وہ سب چہرے ایک جیسے کیوں لگتے تھے؟ مجھے دیکھ کر ان چہروں میں جڑی ہوئی آنکھوں میں درد اور رحم کیوں بھر آیا تھا؟ وہ حیران تھا کہ یہ اجنبی چہرے اس کے ہمدرد کیسے بن گئے تھے؟ وہ تو محض ایک رات گزارنے کے لئے جا رہا تھا۔ اس نے تو کوئی جرم نہیں کیا تھا' کوئی غلطی نہیں کی تھی' اس میں اور ان چہروں میں کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ اسی لئے تو وہ ان کی دکھ بھری نظروں کو کاٹتا ہوا اس طرح اکڑ کے گزرا تھا جیسے ان سے بالکل الگ ہو۔

رات کی ہر بات اسے دور کا واقعہ لگتی تھی مگر پہلے تھپڑ کی آنچ وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا جو ایک موٹی سی گالی کے ساتھ اس کے گال پر پڑا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا کہ گالی دینے والے کی گردن پر مروڑ دے' مگر جب چاروں طرف سے چوڑے چوڑے ہاتھ سیر سیر بھر والوں کی طرح اس پر گرنے لگے تھے تو وہ چوہا بن گیا تھا۔ اسے چوہوں سے گھن آتی تھی مگر وہ کرتا بھی کیا' چار کے مقابلے میں ایک۔

یہ فلسفی لوگ کتابوں میں کیا کباڑ بھر گئے ہیں' کیا کیا اصول وضع کرتے رہے' کیا کیا تشریحیں اور تعریفیں لکھتے رہے' کہاں ہوتی ہے تہذیب ضمیر اور انسانیت؟ یہاں تو کوئی فلسفہ' کوئی نظریہ' کوئی اصول نہیں ہے' صرف گالیاں ہیں' تھپڑ ہیں' استرے ہیں' بوریاں ہیں اور نلکیاں ہیں اگر میں کتابیں رٹنے کی بجائے جوڈو کراٹے کے چند داؤ ہی سیکھ لیتا تو چار آدمیوں کے سامنے اتنا بے بس تو نہ ہوتا' ایک بار تو چاروں حملہ آوروں کو چت کر دیتا۔ خیال کے اس منظر سے وہ ذرا خاموش ہوا مگر میں تو کتابیں پڑھ پڑھ کر گنوار سے گدھا بن گیا ہوں۔ وہ اپنے علم سے خفا ہو کر سوچنے لگا۔ یہ بڑے بڑے فلسفی صرف مغرب میں کیوں پیدا ہوئے ہیں؟ وہ مشرق میں بھی رہتے تو انہیں تجربے کی مختلف کیفیت سے بھی گزرنا پڑتا۔ انہیں بھی میری طرح کیڑا مکوڑا بنا دیا جاتا تو پھر پوچھتا فکر میں کتنی قوت ہے؟ ادراک کیا ہوتا ہے اور جب کچھ بھی نہیں ہوتا تو محض تصور کیسی کیسی ڈراؤنی شکلیں بناتا ہے جو حقیقی ہوتی ہیں؟ مغربی مفکروں کا علم کتنا نامکمن ہے؟ ان کی سوچ کس قدر محدود ہے؟ ان کے گھڑے ہوئے اصول کتنے ناپختہ ہیں وہاں تو دو ہزار سال پہلے جب سقراط کو زہر کا پیالہ دینے کا جرم کیا گیا تھا تو ساتھ ہی سقراط کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ زہر کس طرح جلد اثر کرتا ہے تا کہ اس کی موت آسان ہو جائے'

ہمیں شاید دو ہزار سال بھی پیچھے دھکیلا جا رہا ہے کہ مر مر کے جینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

سقراط پر یہی الزام تھا کہ وہ نوجوانوں کو گمراہ کرتا تھا۔ پھر ہمیں اس کی اور اس کے شاگردوں کی تعلیمات کیوں پڑھائی جاتی ہیں؟ ہمارے پاس شاید پڑھنے کو کچھ اور ہے ہی نہیں! سفاکی تو کسی تہذیب کا عنوان نہیں بن سکتی۔ اگر کوئی بنائے گا تو خود ہی شرمندہ ہو جائے گا۔ ہمارے فلسفی نہ سہی' صوفی تو ہیں' وہ جو دنیا میں دنیاداری سے بے نیاز زندگی میں بعد از موت کے اسراروں کے متلاشی اور مرنے کے بعد دنیاداروں کی دعاؤں کا وسیلہ۔ انکی تعلیمات میں بھی ایسی بدی کا ذکر نہیں ہے جو انسان کو چوہا بنا کر قہقہے لگاتی ہے۔ جو انسان کی عزت نفس اور ذہن پر حملہ آور ہوتی ہے۔ ذہن نہ رہے تو انسان ہے کیا؟ ایک کمزور سا جانور! کائنات کی ارذل ترین مخلوقوں میں سے ایک مخلوق! ذہن کے بغیر تو انسان صوفی بھی نہیں بن سکتا! ان بزرگوں کو شاید ایسے لوگوں سے پالا نہیں پڑا تھا جو کئی ولایتوں سے بات اگلوانے کے طریقے سیکھ کے آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے دو چار ہوتے تو انہیں ایک اچھے نام کے ساتھ دعا بھی دے جاتے کہ مشرق میں زندہ رہنے کا یہی ایک طریقہ ہے مگر ہم یہ کیسے کہتے ہیں کہ پانچ چھ سو سال کی گرد بھی ان بزرگوں کی تعلیمات کو بوسیدہ نہیں کر سکی! علم تو ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے تجربہ نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے' دنیا تو ہر وقت رنگ بدلتی رہتی ہے۔ پانچ چھ سو سال کیا' ایک رات میں بہت کچھ بدل جاتا ہے' صرف ایک رات میں

رات کی ہر بات اسے دہشت زدہ کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا' خوف پانی بن کے کوٹھڑی میں بھر رہا ہے' ٹخنا' ٹانگ' گھٹنا' ران' کمر۔ اس حالت میں بھی اسے غصہ آ گیا' کم بختوں نے اس مکروہ صورت کے حکم پر مجھے کیلے کی طرح کیسے چھیل ڈالا تھا۔ میرے کپڑے چھلکوں کی طرح اتار کر ایک طرف پھینک دیئے تھے میں نے ششدر کھڑا انہیں دیکھتا رہا تھا۔ جیسے میں تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے ہوں اور وہ پانچوں کے پانچوں میرے سامنے ننگے کھڑے ہیں' پتہ نہیں آدمی کپڑے کے ننگا ہوتا ہے یا کپڑے اتار کے؟ مجھے تو اپنی عریانی کا احساس اس وقت ہوا تھا جب اس مکروہ صورت نے گرج کر کہا تھا۔ بند کر دو اس سکھ کو بوری میں۔

بوری میں بند ہو کر اسے یوں لگا تھا جیسے وہ قبر میں ہے اور اس پر قبر کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔ وہ جب دسویں میں پڑھتا تھا تو ایک دن قبرستان سے واپس آتے ہوئے مولوی صاحب نے بتایا تھا قبر کا عذاب بڑا سخت ہوتا ہے' زمین چاروں طرف سے دوڑتی ہوئی آتی ہے اور لحد میں گناہ گار کی ہڈی پسلی ایک کر دیتی ہے' اس نے بھولپن میں پوچھ لیا تھا۔ جن کی قبر نہیں ہوتی جنہیں جلا دیا جاتا ہے جو ڈوب جاتے ہیں' انہیں قبر کیسے سزا دیتی ہے؟ مولوی صاحب ناراض ہو گئے تھے انہوں نے کہا تھا یہ کلمہ کفر ہے وہ مولوی صاحب کا چہرہ دیکھ کے ڈر گیا تھا۔ کل رات بھی وہ ڈر گیا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا تھا خدا کے لئے مجھے بوری سے نکالو۔ وہ تو یہ بھی بھول گیا تھا کہ بوری

سے باہر نکلے گا تو ننگا ہوگا' بندروں کی طرح ابھی سے چیں بول گئی بچہ جی کی۔ مکروہ صورت آدمی کی آواز بھی کتنی مکروہ تھی ذرا بھی مزہ نہیں آیا' سب سالے بکریاں ہیں' بوری میں ہی بول جاتے ہیں' بناسپتی گھی کے بنے ہوئے ہیں' واہ کیا لوگ آتے تھے انگریزوں کے زمانے میں! گھنٹہ گھنٹہ بھر الٹے لٹکے رہتے تھے' آنتیں حلق تک آجاتی تھیں' آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا تھا' پھر بھی ایک ہی نعرہ لگاتے تھے ''انقلاب زندہ باد' ان لوگوں کو سزا دے کے مزہ آتا تھا اس بندر کے بارے میں پڑھا تھا کہ بڑا جی دار ہے مگر یہ بھی بھیڈ و نکلا' فائل بھی بعض وقت جھوٹ بولتی ہے اس نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا تھا' ماتحت بھی ہنسنے لگے تھے' کالی دیواروں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا' کرالو اس سے دستخط' اگر یہ چپڑ چپڑ کرے تو ترکیب نمبر تین استعمال کرنا' مرتا ہے تو مر جانے دو' میں سب سنبھال لوں گا' بہت پڑی ہے زمین اسے گاڑنے کے لئے! وہ یہ ہدایت اتنی آسانی سے دے کر چلا گیا تھا جیسے کھیر نگل رہا تھا۔

میں نے کس کاغذ پر دستخط کئے تھے؟ دھند میں سے ایک بہت بڑا کھڈ نکل کر اس کی طرف بڑھا' میں نے تو کچھ پڑھا ہی نہیں تھا۔ وہ آدمی مجھ پر اچانک کتنا مہربان ہو گیا تھا' جس نے مجھے پہلا تھپڑ مارا تھا' بہت بڑا مکار تھا' کہتا تھا ہم بھی تمہارے بھائی ہیں' تمہیں اذیت دے کر ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوتی' کیا کریں اوپر والوں کا حکم ہے۔ نوکری کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ شاباش کر دو اس کاغذ کے پرزے کے چاروں طرف دستخط میں نے چپ چاپ دستخط کر دیئے تھے۔ پڑھ لکھ کے بھی گنوا دیا ہے میں نے! وہ اپنے آپ پر جھلایا پتہ نہیں کیسے بیان پر میرے دستخط لئے گئے وہ کم بخت اس پر جیسے دیوار میں سے خوف کا ایک اور وار ہوا۔ میں پڑھنا بھی چاہتا تو کیا پڑھتا' ٹکٹکی کے خیال سے ہی ہوش گم ہو گئے تھے اور وہ اسی سی جی کی مشین اس کا نام سن کر تو میری بوٹی بوٹی لرزنے لگی تھی۔ وہ مکروہ صورت کہتا تھا اس کے ہرتا کا سرا انگارے کی طرح ڈستا ہے اور وہ میرے لئے گرم کی جا رہی ہے' میرے لئے تو قانی کی وہ بوندیں ہی کافی تھیں جو بوری میں سے رس رس کر چاقو کی طرح میرا جسم کاٹ رہی تھیں' میں نے اپنے حلق پر موت کا پنجہ محسوس کیا تھا۔ میرا دل آہستہ آہستہ بجھنے لگا تھا' انہوں نے مجھے پڑھنے کے قابل ہی کب چھوڑا تھا؟ وہ کاغذ تو میرے سامنے اس وقت لایا گیا تھا' جب میں اندھا ہو رہا تھا۔

دستخط لینے والے مکار شخص نے کہا تھا تم تو ہمارے ملکی ہو۔ بڑا ہی ستم ظرف تھا ملک تو گھر ہوتا ہے' گھر میں یہ کوٹھڑی کہاں سے آ گئی؟ گھر سزا کیسے بن گیا؟ گھر میں میری بے عزتی کیوں ہوئی؟ دستخط لینے کے بعد اس شخص کے چہرے پر کیسی شیطانی مسکراہٹ ناچنے لگی تھی کہیں ایسے ہوتے ہیں ملکی' ہم وطن' ہم سفر' ہم راہی؟ بھلا اپنے لوگوں کو اذیت دے کر کوئی چہرہ مسکرا سکتا ہے؟ وہ کون لوگ تھے جو مجھے پکڑ کر یہاں لائے تھے؟ کہیں میں کسی غیر ملک میں تو نہیں ہیں؟ میں دشمنوں کے نرغے میں تو نہیں ہوں؟ میرا بیان دشمن

کے ریڈیو سے تو نشر نہیں ہوگا؟

اس نے ذہن پر زور دے کر سوچا تو شام والا بابا پھر سے سامنے آ گیا۔ وہ تو میری ہی زبان میں بات کر رہا تھا۔ وہ غیر ملکی ہرگز نہیں تھا مگر مجھے سزا دینے والے ضرور پتھر کے آدمی تھے' کتنے بھاری ہاتھ تھے ان کے کسی دوسرے ملک سے کرائے پر منگائے گئے ہوں گے لیکن وہ بھی میری ہی زبان میں باتیں کر رہے تھے' ویسی ہی گالیاں بک رہے تھے جو ہمارے گلی محلوں میں گونجتی رہتی ہیں انہیں وہ بھی باہر سے نہیں آئے تھے' نہیں کے تھے مگر کیسے؟

بابا صحیح کہتا تھا یہ کوٹھڑی کبھی کبھار ہی کھلتی ہے' ہر طرف بساند کے بھبکے اڑ رہے ہیں' اب اس کی ناک بھی کام کرنے لگی تھی کیا بند کوٹھڑی میں ہوا بھی سڑ کر بدبودار ہو جاتی ہے' برساتی تالاب میں محصور پانی کی طرح کسی محکوم ملک کے لوگوں کے خیالات کی طرح' اس کوٹھڑی میں پتہ نہیں کتنے ذہن اور صحتیں پیسی گئی ہوں گی؟ ان کی بو بھی دیواروں میں بس گئی ہے' ان لکیروں کی طرح جن میں کسی جانے والے کی زندگی کے دن قید ہیں بابا تو کہہ رہا تھا' یہ کوٹھڑی نئی نئی بنی ہے مگر آزادی تو اب بتیس سال پرانی ہو گئی ہے' بتیس سال تو بہت ہوتے ہیں' تین نسلیں گزر جاتی ہیں۔ وہ مکروہ صورت کس انقلاب کی بات کر رہا تھا۔ جسے مار پیٹ کرا سے مزہ آتا تھا۔ میں نے تو کسی انقلاب کا نام نہیں لیا تھا۔ پھر اس کے چاروں ماتحت مجھ پر کیوں چڑھ دوڑے تھے؟

اس کی سوچ اڑتے ہوئے پتنگ کی طرح رات کو پھلانگ گئی' بڑا افسر تو بڑا ہی زہریلا ہوگا' اسی کے حکم پر مجھے ایک رات یہاں رکھا گیا تھا' مصروف وصروف خاک ہوگا' مجھے ایک جلوہ دکھانا چاہتا تھا' مگر کیوں؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ایک ٹنڈے باپ کا بیٹا' جو وظیفے پر پڑھ رہا ہو کسی کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ میں تو مر مر کے اپنی تعلیم مکمل کر رہا ہوں' اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں' اس کوٹھڑی میں وہ پہلی بار سچ مچ رویا۔

تالے میں چابی گھومی تو وہ اچھل کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا' جیسے دیوار میں گھس کر دیوار بن جائے گا' زندگی خوف بن کے اس کے اندر چکرانے لگی اور اس کی آنکھیں جھپکنا بھول گئیں۔ دروازہ کھلا تو ایک ڈھیلی ڈھالی میلی سی وردی اندر آئی' مگر اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے اس کی بزدل آنکھیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔

چلو تمہیں بڑے صاحب نے بلایا ہے۔ وردی میں سے آواز آئی۔

وہ کھلے دروازے میں سے اسے طرح باہر نکلا' جیسے پنجرے میں مہینوں تک بند رہنے والا تیتر آزاد ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دھوپ کی تیز مرچیں لگیں۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا' پھر وردی کے پیچھے اس طرح چلنے لگا' جیسے اس کے پاؤں میں پہیے لگے ہوں' سکیٹس

بندھے ہوں' خود بخود ہی چلتے جا رہے ہوں' ٹانگیں دکھ رہی تھیں' پھر بھی آڑھی ترچھی چل رہی تھیں۔

اس بار وہ بارکوں کے درمیان میں سے نہیں' پچھواڑے سے گزر رہا تھا۔ اس نے ذرا دیر کو سکون سے آنکھیں بند کر لیں' وہ ان چہروں کو کیا منہ دکھاتا جو کل شام سلاخوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ ان کی رحم بھری نظریں تو اب اس سے اٹھائے نہ اٹھتیں کل وہ ان کے درمیان سے اکڑ کر گزرا تھا۔ صحیح سالم' صاف ستھرا اور آج! چلتے ہوئے وہ اس طرح لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا جیسے اس کے پھیپھڑے منجمد ہو گئے ہیں اور وہ انہیں دھونکنی سے گرم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ گیلری میں داخل ہوا' جہاں کل دو باوردی شخص اسے چھوڑ گئے تھے سیڑھیاں چڑھتے ہی اس شخص کا ہیولا کوندے کی طرح لپکا' جو کل شام گیلری میں بنی ہوئی ایک کوٹھڑی کے چمکتے ہوئے سفید دروازے میں سے نکلا تھا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا' ہونٹوں پر خون جما ہوا تھا اور وہ جیسے نیند میں چلتا چلا جا رہا تھا' اس نے غور سے دیکھا' گیلری کے غار میں چھ سفید چمکتے ہوئے دروازے تھے۔ ہر روز دروازہ سنگ مزار لگتا تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر نظریں جمائیں' اس پر کوئی لکیر' کوئی نام نہیں تھا' اصلی موت ایک بار آتی ہے اور دوسروں کے لئے مرنے والے کا نام اور یادیں چھوڑ جاتی ہے مگر زندگی میں جو موت بار بار آتی ہے وہ کوئی نام چھوڑ کر نہیں جاتی۔ یہ قبریں مردے بدلتی رہتی ہیں اور یادیں! ہاں وہ انگریزوں کے زمانے میں آنے والے ذبح کئے ہوئے بکروں کی طرح الٹے لٹکے ہوئے انقلابی وہ تو مکروہ صورت کو یاد تھے وہ اس مزے کو ترس رہا تھا جو انہیں ایذا دے کر اٹھاتا تھا۔ اب وہ بھی ان بارکوں میں دھیرے دھیرے مر رہا تھا۔ لطف و مسرت کو ترستے ہوئے لطف و مسرت کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔

بڑا افسر تو شائستہ اور خوش شکل نکلا' اس کا تو خیال تھا کہ وہ ایک کالا بھجنگ دیو ہوگا' جس کے لمبے لمبے دانتوں سے خون ٹپک رہا ہوگا' جس کے سارے جسم پر بال ہی بال ہوں گے' وہ تو بڑی نرمی سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سارے جسم پر بال ہی بال ہوں گے۔ وہ تو بڑی نرمی سے باتیں کر رہا تھا اسے دیکھ کر وہ ذرا سا پریشان ہوا۔ اس نے دو تین بار اپنا سر جھٹکا جیسے افسوس کر رہا ہو' پھر نظریں جھکا لیں' ایک طرف قطار میں وہ پانچوں آدمی بھیگی بلی بنے کھڑے تھے جو رات کے کسی دیو کی اولاد لگتے تھے۔

دیکھو تم نے اس غریب کی گت بنا دی ہے۔ جوانی میں ہی اس کی مٹی خراب کر دی' اب یہ خاک پڑھے گا' تم لوگوں نے تو اسکا سارا فلسفہ نچوڑ کر رکھا ہے۔ اب یہ کس کام کا رہ گیا ہے؟ میں نے تو اسے بلوایا تھا کہ غریب ہے' وظیفے پر پڑھ رہا ہے۔ ہمارے لئے بھی تھوڑا بہت کام کر دے گا تو اسے چار پیسے اور مل جائیں گے۔

افسر کی ذرا سی اونچی آواز سن کر ڈھیلی ڈھالی وردی وہاں سے کھسک گئی۔

تم لوگ کتنے عرصے سے یہاں کام کر رہے ہو؟ اس کا نام بھی نہیں پوچھا' یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ کہاں سے لایا گیا ہے' بس فائل اٹھائی اور شروع ہو گئے!

جناب آپ نے اسے مہمان خانے میں۔

میں نے مہمان خانہ نہیں کہا تھا' صرف مہمان کہا تھا' مہمان خانے والے کو تم نے پندرہ میں بند کر دیا ہے تمہارے کان بھی اب بجنے لگے ہیں' تمہیں ریٹائر ہو جانا چاہیے۔

جی جناب بڑے افسر کو الزام دینے والا کھنچ کر اٹینشن ہو گیا' اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

اس حالت میں اسے باہر بھیجوں تو بڑا افسر کچھ سوچنے لگا یونیورسٹی میں ہنگامہ ہو جائے گا' لڑکے تو فساد کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہی رہتے ہیں امتحان ٹالنے کے لئے وہ اسے پتلا بنا کر سڑکوں پر نکل آئیں گے ایک مصیبت کھڑی ہو جائے گی' محکمہ بدنام ہو جائے گا' تم لوگوں کی پیٹیاں اتر جائیں گی۔

جی جناب' پانچوں کی آواز قدم ملا کر نکلی' پیٹی اتر جانے کے خوف سے ان کے قد انچ انچ کر کے چھوٹے ہونے لگے کیا پتھر بھی سکڑ سکتے ہیں۔اس نے پہلی دفعہ اپنے بھاری بھاری پپوٹے کھول کر ان کی طرف غور سے دیکھا۔

کتنے دن لگیں گے اس کے بال بڑھنے میں؟ بڑے افسر کی نظریں اس کے سر پر ٹکنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر بار بار پھسل جاتی تھیں' وہ بھی شاید دل میں اس مکروہ صورت کی طرح ٹھگنے سپاہی کے استرے کو داد دے رہا تھا۔

کوئی ایک مہینہ جناب! مکروہ صورت آدمی منمنایا۔

میں کب تک تم لوگوں کی غلطیوں پر پردہ ڈالتا رہوں گا' بڑے افسر نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکائیں اور دونوں انگوٹھے ملا کر پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی' ایسا لگتا تھا کہ اس کا چہرہ اس کے جسم سے جدا ہو گیا ہے۔

جاؤ اور اس کے ایک ماہ کی نظر بندی کے کاغذات تیار کر کے لے آؤ' دیکھو اب اسے آرام سے رکھنا۔

مکروہ صورت آدمی سیلوٹ کر کے مڑا تو بڑے افسر کی آواز نے اس کے پاؤں باندھ دیئے' ستو کوٹھری نمبر پندرہ والے کا بیان مجھے کل صبح تک مل جانا چاہیے' کل کی ڈاک سے اوپر بھیجنا ہے۔

◆◆◆

مختلف مضمون کا آدمی

''گیانو قتل ہوگیا ہے۔'' دم بھر میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔

''اچھا ہوا موذی مارا گیا۔ سارا گاؤں لوٹ کے کھا گیا تھا۔''

نہ جانے کس تکڑی سے تولتا تھا' ادھار اترنے میں نہیں آتا تھا۔

لفنگے کی آنکھ میں شرم کا ایک ڈورا بھی نہیں تھا۔

اپنے آپ کو بڑا تیس مار سنگھ سمجھتا تھا۔

داڑھی سفید ہوگئی تھی پر اپنی بدعادتوں سے باز نہیں آیا تھا۔

کتنا لالچی کراڑ تھا' ہر طرف آگ لگی ہے اور وہ گاؤں سے تین میل دور نکل گیا وصولی کرنے کے لئے۔

گلی گلی میں گیانو پر تہمتوں کے گھڑے انڈیلے جا رہے تھے' جہاں کہیں چار آدمی کھڑے تھے' گیانو کا کردار چیڑ پھاڑ رہے تھے' ایسا لگتا تھا کہ گاؤں میں کوئی شخص بھی اس کی موت پر ملول نہیں تھا۔ ایک بڑھیا یونہی عادتاً رونے لگی تھی کہ آخر گاؤں کا آدمی تھا مگر اپنے بیٹے کی آنکھوں میں خون اترتا دیکھ کر وہ بھی آنسو پی گئی تھی' لوگوں نے ناخلف بیٹے کی نازیبا حرکت دیکھی تھی' لیکن کسی نے اسے برا بھلا نہیں کہا تھا۔ یہ بات البتہ کچھ عجیب تھی کہ گاؤں سے کوئی بھی شخص گیانو کی تلاش دیکھنے اور قتل کی پرچول کرنے کے لئے نہیں گیا تھا حالانکہ وہاں ایک سانپ بھی مارا جائے تو بچے بوڑھے جوان سبھی اسے دیکھنے کو پہنچ جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔

کس نے مارا ہے؟

کس وقت مارا ہے؟

بس شوکر سن کر ہی لاٹھی چلا دی ہوگی۔

اور نہیں تو کیا؟ ایسا کوڑیالا ناگ دیکھ کر آدمی بت بن جاتا ہے ہاتھ نہیں اٹھتا۔ سوال و جواب کا سلسلہ اس وقت ختم ہوتا ہے' جب کوئی چیل جھپٹا مار کے سانپ کا جسد خاکی اڑا لے جاتی ہے یا چیونٹیوں کا لشکر اس کی الف ننگی لاش کا ریشہ ریشہ الگ کرکے اسے اپنے بل میں دفن کر دیتا ہے۔

نمبردار نے اطلاع کی تھی تو تھانیدار تین سپاہی لے کر آیا تھا'اس نے موقع دیکھا تھا' نقشہ بنوایا تھا اور گاؤں میں واپس آکر پوچھ گچھ شروع کی تھی۔

کیا پتہ چلتا ہے جناب آج کل ایک بزرگ نے اپنی مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی کھجا کر کہا تھا گاؤں میں اخبار بھی آتا ہے اور کپتان صاحب کے پاس ریڈیو بھی ہے۔ ہر جگہ مہمان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں جناب پتہ نہیں' یہاں کس کا خون جوش مار گیا۔

ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ تھانیدار بھی اس بزرگ سے متفق نظر آتا تھا۔ تفتیش تو کرنا ہی ہوگی' میرے حلقے میں قتل ہوا ہے' اس نے دس بارہ سکھوں اور ہندوؤں کی طرف چور نظروں سے دیکھا تھا' وہ کبوتروں کی طرح ایک قطار میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے' گرنتھی کی لمبی سفید داڑھی بکھر بکھر کر ہوا کا رخ بتا رہی تھی۔

تم لوگوں کو شبہ ہے کسی پر؟

نہیں مہاراج' گرنتھی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا تھا' یہاں تو سب لوگ ہمارے بھائی بند ہیں' ہمارے مائی باپ ہیں ہم تو رات کو بھی دروازے بند نہیں کرتے' ہم لوگ تو ایک دوسرے کے۔

معلوم ہے' معلوم ہے' نمبردار کو گرنتھی کی تقریر بری لگ رہی تھی۔ تھانیدار صاحب نے جو کچھ پوچھا ہے' اسکا جواب دو۔

نمبردار کے روکھے پھیکے لہجے نے گرنتھی کو پریشان کر دیا تھا۔ نہیں مہاراج ہمیں کسی پر شبہ نہیں ہے۔ ہماری ایک چھوٹی سی بنتی ہے' گیان سنگھ کی لاش ہمارے حوالے کر دی جائے' اسکا کریا کرم کر کے ہم کل ہی کیمپ چلے جائیں گے۔

یہ قتل کا کیس ہے' تھانیدار کو اپنی ذمہ داری یاد تھی۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کرانا ہوگا' تم لوگ اسے ہسپتال لے جانے کا انتظام کرو۔

کبوتروں کی پوری قطار چونک کر کھڑی ہوگئی تھی۔ مہاراج کے قلم میں بڑی طاقت ہے جو چاہیں لکھ دیں' ہم سے لکھوانا چاہیں تو حکم دیں' ہم سب مل کر لکھ دیتے ہیں کہ گیان سنگھ اپنی آئی سے مرا ہے' کسی نے اس کی ہتیا نہیں کی۔

بیچارے کبوتر پوسٹ مارٹم کا نام سن کر ہی غوں غوں' کرنے لگے تھے۔ ہسپتال سات کوس پر تھا اور کندھوں پر خون آلود لاش اٹھا کر چلنا ہو تو سات کوس بھی دنیا کا دوسرا سرا معلوم ہوتے ہیں۔ ہسپتال کے راستے میں کئی ایسے ویرانے بھی پڑتے تھے' جیسے ویرانے میں گیا تو مارا گیا تھا۔

ٹھیک ہے' تم لوگ اپنا بیان لکھوا دو اور جلدی سے مقتول کی لاش جلانے کا بندوبست کرو۔ تھانیدار نے احسان جتاتے ہوئے کہا تھا۔ اور دیکھو میرے تھانے میں نفری بہت کم ہوگئی ہے' صرف دس سپاہی ہیں اور بیس میل لمبا علاقہ ہے' سمجھ گئے نا۔

جی مہاراج گرنتھی کے ساتھ دوسرے سکھوں اور ہندوؤں نے ہاتھ جوڑ کر نظریں جھکالی تھیں' ان کے رنگ اتنے زرد پڑ گئے تھے کہ وہ یرقان کے مریض معلوم ہوتے تھے۔

آپ بالکل فکر نہ کریں' تھانیدار صاحب بوڑھے نمبردار نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا تھا ہم لوگ رات بھر پہرہ دیں گے' گیانو کے دن تو پورے ہو گئے تھے۔ موت اسے گھسیٹ کر بیاباں میں لے گئی تھی۔ یہاں گاؤں میں کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میں کل خود ان کے ساتھ چل کے جاؤں گا اور انہیں کیمپ میں داخل کرادوں گا' ان لوگوں نے ایک عمر گزاری ہے ہمارے ساتھ ان کا کچھ حق ہے ہم پر۔

بڑی اچھی بات ہے' تھانیدار نے نمبردار کو داد دی تھی اور پھر نتھنے پھلا کر گرنتھی کی طرف دیکھا تھا' تم لوگ کل صبح ضرور چلے جانا' میں یہاں دیر نہیں رک سکتا' مجھے دو اور وارداتوں کی تفتیش کرنا ہے۔

بہت اچھا مہاراج گرنتھی اپنے ساتھیوں کو لے کر گلی میں اتر گیا تھا' وہ سب ٹوٹے پھوٹے قدموں سے آڑے ترچھے چلتے ہوئے اس طرح اپنے گھروں کو جا رہے تھے جیسے دن بھر مشقت کرنے کے بعد پابہ زنجیر قیدی جیل کو واپس جاتے ہیں۔

ہم لوگ جب گیانو کو جاننے اور پہچاننے لگے تھے تو اس کی داڑھی کھچڑی ہو رہی تھی مگر داڑھی کے گھنگر بتاتے تھے کہ کبھی مینڈھوں کی طرح بٹ کر باندھی جاتی ہو گی' ان دنوں بھی وہ اتنا طاقتور تھا کہ اپنے چوڑے ہاتھوں سے بڑے بڑے پتھریوں اٹھا کے پھینک دیتا تھا جیسے وہ لکڑی کے ہوں اور جب گاؤں کے نوجوان ہاتھ ڈالتے تھے تو وہی پتھر لوہے کے بن جاتے تھے' اس نے کبڈی تو چھوڑ دی تھی کہ یار و اب لنگوٹ باندھ کے لڑکوں بالکوں کے ساتھ ناچنا اچھا نہیں لگتا۔ کبڈی کا آدھا مزہ تو ناچ میں ہے۔ باقی تو سب بھاگ دوڑ ہے۔ مگر کلائی پکڑنے میں اسے عار نہیں تھی۔ کوئی نوجوان اگر جوش میں آ کر اسے زور آزمائی کی دعوت دیتا تھا تو وہ فوراً پلتھی مار کر اس کے مقابل بیٹھ جاتا تھا۔ اس کا نوجوان حریف جب لال پیلا ہو کر بھی اپنی کلائی چھڑانے میں ناکام رہتا تھا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر چہکتا تھا اور ہارنے والے نوجوان کی پیٹھ ٹھونک کر کہتا تھا تم میں بڑا دم ہے میرے چاند' خوب کسرت کرو' تیل کی مالش کیا کرو' مونگرے کھاؤ اور مکھیوں سے بچے رہو۔

مونگرے کھانے کا مشورہ تو کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر سب جانتے تھے کہ جوان عورتوں کو وہ مکھیاں کہتا تھا اور اس نصیحت کے معاملے میں خود ''میاں نصیحت'' تھا بچوں کے سامنے گاہک عورتوں سے باتیں کرتے ہوئے بھول جاتا تھا کہ بچے بھی بڑے ہو جاتے ہیں اور بڑوں کی چند باتیں بچوں کو بھی معلوم ہوتی ہیں۔

گیانو کچھ ایسا مذہبی آدمی نہیں تھا۔ گوردوارے میں کم ہی جاتا تھا' کہتا تھا جہاں ماتھا ٹیک دو وہیں اونکار ہے' سارے جگ کے رب کو چار پتھروں کی کوٹھڑی میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ کرپان وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا اور فجر کی اذان کے بعد اداس کرتا ہوا گھر سے نکلتا تھا' دیکھا تو کسی نے نہیں تھا مگر سب کہتے تھے کہ اس کے ڈب میں بھرا ہوا پستول میں بھی ہوتا تھا' اسی کے غم میں وہ پتھریلی زمین پر بھی سر اٹھا کے چلتا تھا اور بڑے سے بڑے آدمی کو بھی مہاراج کہہ کر مخاطب نہیں کرتا تھا۔

گاؤں کے دوسرے سکھوں اور ہندوؤں سے وہ اس لئے بھی مختلف تھا کہ زرعی زمین کے ایک ٹکڑے کا مالک تھا اور اس کے کھیت میں ایک کنواں بھی تھا' اس کی چال اگر بنیوں والی ہوتی تو اپنے کھیت سے بہت کچھ کما سکتا تھا' مگر اسے کھیتی باڑی ذرا بھی پسند نہیں تھی' وہ اسے مٹی کھودنے اور خاک پھانکنے کا کام کہتا تھا۔ وہ اسی پر خوش تھا کہ زراعت پیشہ تھا اور سرکار کو مالیہ ادا کرتا تھا۔ گاؤں کے دوسرے ہندوؤں اور سکھوں کو چھوٹو رام نے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اس کی اصلاحات کے ذریعے زرعی اراضی کے سارے رہن نامے منسوخ ہو گئے تھے اور ایک ہی جھٹکے میں گاؤں کے بڑے بڑے سیٹھ موچیوں اور نائیوں کے ساتھ شمار ہونے لگے تھے۔ ان کی ''اصل'' بھی ڈوب گئی تھی اور سود بھی' انہیں زمین خریدنے یا رہن رکھنے کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا تھا' گاؤں کے مسلمان کسانوں کو ان کی زمینیں مفت میں واپس مل گئی تھیں۔ ان کے سر سے قرض کا بوجھ اتر گیا تھا۔ اسی لئے وہ اس پنجابی سولن کے گن گاتے تھے۔ سولن' ایتھنز' یونان کا بہت بڑا فلسفی منتظم اور قانون ساز تھا اس نے بھی سارے رہن نامے منسوخ کر دیئے تھے اور مظلوم اور مفلس لوگوں کی کایا پلٹ دی تھی مگر اس وقت جب ہر طرف بغاوت کی بو اڑ رہی تھی اور سولن کے امیر و کبیر ساتھی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ چھوٹو رام پنجاب کا وزیر مال تھا اور ہم نے جو کچھ سکول کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ اس کی اصلاحات سنہرے قانون ضرور تھیں مگر وہ فلسفی وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ وہ سولن سے بہت مختلف تھا' سولن نے تو ایک عرصے تک خود بھی غریبوں کو خوب لوٹا تھا۔ چھوٹو رام نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ ہم نے گاؤں کے ہندوؤں کی زبان سے جب بھی اس کا ذکر سنا تھا' ملیچھ ایسے برے لفظوں کے ساتھ سنا تھا گیانو کا گھرانہ اس لئے بچ گیا تھا کہ اس کے باپ نے کبھی کسی کی زمین رہن نہیں رکھی تھی۔ اس کا دادا تو باقاعدہ ہل چلاتا تھا' کاشت کاری کے ساتھ دکانداری اس کے باپ نے شروع کی تھی۔ اس کا نام بوٹا سنگھ تھا مگر گاؤں کے کسانوں کے لئے وہ بھی چھوٹو رام کی طرح چھوٹو سنگھ تھا۔ گیانو نے کبھی ہل کی ہتھی پر ہاتھ تو نہیں رکھا تھا مگر اپنی زمین کا چکر وہ روز کاٹتا تھا۔ گرمیاں ہوں یا سردیاں اپنے کنویں کے تازہ پانی سے اشنان کرتا تھا اور ہلکا پھلکا ہو کر گاؤں میں واپس آتا تھا۔ کبھی کبھی گھر کے لئے وہ اپنے کھیت سے تازہ سبزیاں بھی لے آتا تھا باقی سب کچھ مزارع کا تھا۔ اس نے کبھی پوچھا ہی نہیں تھا کہ کیا بویا اور کیا کاٹا؟ اس کا اصل میدان اس کی دکان تھی' وہ اس میں بیٹھ کر سودا بیچتے بیچتے دن گزار دیتا تھا'

عصر کی اذان ہوتی تھی تو دکان بڑھا کر کھیتوں میں نکل جاتا تھا۔ پہلے آہستہ آہستہ ٹہلتا تھا پھر تیز تیز چلنے لگتا تھا اور پھر اس طرح بھاگ کھڑا ہوتا تھا جیسے خونخوار کتوں نے اس پر حملہ کر دیا ہے' گاؤں کے بچوں کو اس کا یہ معمول معلوم تھا۔ وہ ایک پہاڑی پر بیٹھ کر انتظار کیا کرتے تھے کہ کب گیانو دوڑے گا اور وہ والی بال کی طرح اچھلتی ہوئی پگڑی دیکھیں گے۔

گاؤں کے اکثر نوجوان اور بزرگ اس سے خار کھاتے تھے۔ پیٹھ پیچھے سب اسے گیانو کہتے تھے' صرف دو بدو وہ گیان سنگھ یا سردار جی ہوتا تھا۔ اس کا احترام اس کی موجودگی کا محتاج تھا۔ لوگ اس کی شہ زوری یا اس کی کرپان یا اس کے ڈب میں دبکے ہوئے پستول سے ہی خوف نہیں کھاتے تھے' اسکی صورت سے بھی مرعوب رہتے تھے جو مغل بادشاہوں کی قلمی تصویر سے ملتی جلتی تھی مگر اس سے جلنے کی اصل وجہ اور تھی گاؤں کے بیشتر باشندوں کے بال اس کی مٹھی میں تھے اور ادھار کی قینچی اس کے ہاتھ میں تھی۔

گاؤں کا کاروبار ادھار پر چلتا تھا ادائیگی فصل کٹنے یا کسی ملازم کا منی آرڈر آنے پر ہوتی تھی۔ ضرورت نہایت خود غرض اور گنوار چیز ہے' کبھی گھڑی یا کیلنڈر نہیں دیکھتی' دن ہو یا رات ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وقت پر ضرورت کی چیز ادھار مل جائے تو یہ بھی ایک احسان ہوتا ہے اور یہ احسان کرنے میں گیانو کا دل دوسرے تمام دکانداروں سے بڑا تھا۔ وہ بھی نقد یا جنس کی شکل میں پائی پائی وصول کر لیتا تھا مگر مقروض کی حالت دیکھ کر' کسی کو اتنا مجبور نہیں کرتا تھا کہ وہ اس سے منہ چھپاتا پھرے' اسے معلوم تھا کہ کسانوں کے گھر میں روکڑ نہیں رکھی ہوتی' فصل پکتی ہے تو چار پیسے ان کے ہاتھ میں آتے ہیں اور وہ سب سے پہلے ادھار چکانے کی فکر کرتے ہیں' اگر کبھی فصل بگڑ جاتی تھی تو وہ ادائیگی کا تقاضا نہیں کرتا تھا۔ پچھلا حساب بتائے بغیر ادھار دیئے جاتا تھا۔ اس کی دکان بھی ہر وقت بھری رہتی تھی۔ گاؤں والوں کی طلب کی ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اس کی بوریوں' کنستروں ڈبوں' مرتبانوں یا پوٹلیوں میں سے نہ نکل آتی ہو۔ کھدر سے لے کر اکڑے اور ورائی تک ہر قسم کا کپڑا بھی اسکی دکان سے مل جاتا تھا' اس لئے لوگ سوچتے تھے کہ جگہ جگہ اپنے نام کا کھا نہ کیوں کھلوائیں صرف گیانو کی دکان پر ہی حساب کیوں نہ رکھیں۔

چند پردہ دار گھروں کے سوا عورتیں ہی گھر کے لئے سودا سلف خریدتی تھیں ادھار کی طرح عورتوں کے سر پر ہی گاؤں کا نظام چلتا تھا اور اب بھی چلتا ہے۔ وہی گھر کا خیال بھی رکھتی تھیں اور گھر والوں کی روٹی پانی کا بھی' وہی مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں' دودھ دوہتی تھیں اور وہی جما کر بلوتی تھیں' چکی پیستی تھیں اور باجرے اور مکئی کی فصل پر سے چڑیاں اور طوطے اڑاتی تھیں اور فصل کاٹنے اور ڈھونے میں گھر کے مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں' بچے پیدا کرنا اور انہیں پالنے پوسنے کے کام ان کے علاوہ تھے' کسی بھی گاؤں میں اگر عورت نہ ہو تو وہ چار دن کھنڈر بن جائے۔ اس کے مرد حقے کی نال کی طرح سوکھ کے لٹک جائیں' گیانو کے گاہکوں میں بھی عورتوں کی

تعداد زیادہ بلکہ بہت زیادہ تھی' کئی عورتیں تو ایک پیسے کی چیز خریدنے کے لئے سارا گاؤں ''جھاگ'' کر اسکی دکان پر پہنچتی تھیں۔ اکثر لوگوں کو یقین تھا کہ گیانو کی کاروباری ترقی میں اس کی مردانہ وجاہت کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یہ بات ایک بزرگ کی زبان پر آ گئی تھی۔ اس نے گیانو کی دکان سے گاہک عورتوں کی ابلتی ہوئی آوازیں سن کر کہا تھا ہاں بھائی' عورت بھی انسان ہوتی ہے۔ وہ نائی کے گھر کی ہو یا تیلی کے گھر کی' اسے بھی دل ''پشاوری'' کرنے کا حق ہے' چوپال پر بیٹھے ہوئے نوجوانوں نے اس بزرگ کو اس طرح گھورا تھا جیسے اس کی داڑھی سے وسمے کا رنگ دھو کر اسے آئینہ دکھا دیں گے۔ بزرگ کو اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً بات بنائی تھی تم لوگ کیا سمجھ بیٹھے' بیچارے گیانو کی نظریں تو ہر وقت جھکی رہتی ہیں' گاہک کو بھگوان سروپ سمجھتا ہے' سب کا پردہ رکھتا ہے میں نے یونہی مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی۔ گاؤں میں ایک سے ایک خوبصورت جوان پڑا ہے گیانو اب تو اب ڈھل چلا ہے۔ بزرگ کی پہلی بات سچ تھی اور دوسری غلط دراصل خوف فساد خلق سے بعض سچی باتیں نہ کہنے کی ہوتی ہیں اور بعض جھوتی باتیں کہنے کی۔ اس روز بھی سب نے غلط کو صحیح مان لیا تھا اور ذرا دیر بعد ہوا میں گپیں اڑنے لگی تھیں' یہ خلق خدا بھی خوب شے ہے۔ اپنے آپ کو بھی چکر دے کر خوش ہو جاتی ہے۔

لوگ کچھ بھی کہتے ہوں' ہم بچوں کے لئے گیانو بہت اچھا تھا' سکول سے چھٹی ملنے کے بعد ہم لوگ گھوم پھر کر پھل لوٹتے تھے۔ کبھی بیر کبھی توت' کبھی انجیر اور کبھی چھوٹے سیب اور خوبانی۔ رکھوالے اگر ہوشیار ہوتے تھے تو ہم لوگ خالی ہاتھ واپس لوٹتے تھے۔ اس روز گیانو کی دکان کے سامنے ہمارے قدم خود بخود سست پڑ جاتے تھے وہ دھیمے دھیمے مسکرا کر پوچھتا تھا' کیوں بچو آج کچھ نہیں ملا؟ پھر کیا ہوا؟ ایسی رونی صورت تو نہ بناؤ' ادھر آؤ' اور وہ تین چار چار ریوڑیاں اور مکھانے یا ایک ایک سنگترے ایسی کھٹی میٹھی گولی ہم سب میں بانٹ کر کہتا تھا لو اننداوٹو اور اپنے اپنے گھر جاؤ تمہاری مائیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ صرف خانو کو وہ اپنے پاس بٹھا کے کہتا تھا خانو بیٹے تمہاری تو ماں نہیں ہے' تمہاری ڈھوک بھی دور ہے تم تھوڑی دیر یہیں آرام کرو خانو ہر روز اسی جگہ ہمارا ساتھ چھوڑ جاتا تھا گیانو دکان میں بیٹھے بیٹھے اس سے سبق سنتا تھا' سوال حل کراتا تھا اور املا درست کرتا تھا لکھائی پڑھائی ختم ہوتی تھی تو کھانا کھلانے کے لئے اسے گھر میں لے جاتا تھا۔

گیانو کا مکان گھڑے ہوئے نیلے اور سفید پتھروں کی ایسی ترتیب سے تعمیر کیا گیا تھا کہ اس کی دیواریں شطرنج کی بساط لگتی تھیں' دکان میں بھی مکان کا حصہ تھی' گھر کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور دوسرا دکان میں' گلی والا دروازہ اتنا بڑا اور مضبوط تھا کہ لگتا تھا کہ کسی قلعے سے اتار کر لایا گیا ہے۔ دکان نشیب میں تھی' لکڑی کی ایک سیڑھی اسے گھر کے دالان سے ملاتی تھی۔ دکان کے بیرونی

دروازے پر لکڑی کا بڑا خوبصورت کام بنا ہوا تھا دونوں پٹ ملتے تھے تو کسی شاہی باغ کی دھندلی سی تصویر سامنے آجاتی تھی۔اس کے گل بوٹوں کا رنگ تو اب اڑ چکا تھا' مگر گلکاری کاریگر کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔گیانو کے پتا جی خوش ذوق آدمی تھے۔انہوں نے گھر کی طرح دکان کا دروازہ بھی بڑے شوق سے بنوایا تھا' اس کے لئے چنیوٹ سے کاریگر منگائے تھے' لوگ یقیناً ان کی بڑی عزت کرتے ہوں گے کیونکہ کہتے ہیں کہ ان کی ارتھی اٹھی تھی تو گاؤں آدمیوں سے خالی ہو گیا تھا گیانو میں بھی ان کے کچھ گن نظر آتے تھے مگر اس نے اپنی ساری توانائی دکان میں صرف کر دی تھی۔اس نے کھاتے تو بڑھا لئے تھے مگر ان کے سوا باپ کے ترکے میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا' اس کی دکان کے دروازے کے ساتھ تین ساڑھے تین گز لمبی اور ایک ڈیڑھ گز چوڑی ابرتی سل دھری تھی' یہ بھی اس کے پتا جی کی یادگار تھی' انہوں نے دکان کی شوبھا بڑھانے کے لئے رکھوائی تھی مگر گیانو نے اسے آباد کر لیا تھا۔دن میں کئی بارہ چوپال کی حریف بن جاتی تھی۔

گیانو کو چوپال سخت ناپسند تھی۔وہ اسے بھنگڑ خانہ کہتا تھا' چوپال کی زمین نمبردار کی تھی۔اس لئے جسکی زمین' اس کی عمارت' اور نمبردار سے گیانو کی بالکل نہیں بنتی تھی۔وہ چوپال کے قریب سے منہ پھیر کے گزر جاتا تھا' مگر اس نے چوپال کا بائیکاٹ نہیں کیا تھا۔کسی کی شادی ہوتو رسمی سا بلاوا بھی کافی تھا' وہ سرِ شام چوپال پر آجاتا تھا۔سب کے ساتھ مل کر لڈی ناچتا تھا۔دھریس مارتا تھا۔ٹپے گاتا تھا اور موج میں ہوتا تھا لاٹھی چلانے کے کمال بھی دکھا دیتا تھا گاؤں میں کسی کا انتقال ہو جاتا تھا اور اس کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے چوپال پر فاتحہ خوانی ہوتی تھی تو وہ ضرور آتا تھا اور سب کے ساتھ بیٹھ کر کہتا تھا' دعا پڑھ لیں' اور خود بھی مسلمانوں کی طرح دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا تھا۔فاتحہ خوانی کے لئے دوسرے سکھ اور ہندو بھی آتے تھے مگر وہ الگ تھلگ بیٹھتے تھے اور دعا کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ایک مرتبہ ہم لوگوں نے اپنا تجسس مٹانے کے لئے اس سے پوچھ لیا تھا کہ وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر پڑھتا کیا ہے؟ اس نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا جو دعا تم لوگ پڑھتے ہو' اس کے معنی تمہیں معلوم نہیں ہیں اور جو دعا میں پڑھتا ہوں' وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔بس حساب برابر لیکن یار و دل سے دعا نکلتی ہے۔وہ تو ایک ہی ہوتی ہے نا؟

خانو جب سے سکول میں داخل ہوا تھا' گیانو کے گھر کا فرد بن گیا تھا' وہ چوکے میں بیٹھ کے کھانا کھاتا تھا اور پیتل کے اسی کٹورے میں پانی پیتا تھا جو گیانو کا تھا اور جسے وہ روز اپنے ہاتھ سے مانجھتا تھا' کھا پی کر خانو گیانو کے پلنگ پر ہی سو جاتا تھا۔ایک سکھ گھرانے میں مسلمان لڑکے کی اتنی آزادی پر کئی سکھ اور ہندو ناک بھوں چڑھاتے تھے مگر گیانو انہیں منہ کب لگاتا تھا کہ وہ اس کے منہ پر کوئی اعتراض کرتے۔وہ گرنتھی سے چپکے چپکے شکایت کرتے تھے تو وہ ہنس کے ٹال جاتا تھا۔گیانو کے دو تین سکھ دوست تو اعتراض کرنے

والوں کو الٹا ڈانٹ دیتے تھے۔ معترضوں کی کور اس لئے بھی دیتی تھی کہ جب سے چھوٹو رام کی اصلاحات نے گاؤں کے ہندو اور سکھ جٹیوں کو کنگال کر دیا تھا گورودوارے کا سارا خرچ گیانو برداشت کرتا تھا۔ دوسرے لوگ تو مفت میں عبادت کر لیتے تھے۔

ہندوؤں کا اپنا الگ کوئی مندر نہیں تھا۔ انہوں نے گورودوارے کے ایک کونے میں اپنی ہوتی سجا رکھی تھی یہی کونا ان کا مندر تھا۔ کوئی ہندو مسافر رات گزارنے کے لئے آجاتا تھا تو اسے بھی گورودوارے سے بستر اور چارپائی مل جاتی تھی۔ ہر روز صبح پوجا پاٹ کے بعد ہندو اور سکھ دکاندار وہیں بیٹھ کر گڑ شکر کے بھاؤ طے کرتے تھے۔ گیانو کو ان باتوں پر سخت اعتراض تھا۔ وہ کہتا تھا گورودوارے کو دکان بنا دیا گیا ہے۔ ہندو اسے دھرم شالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں' اسے گورودوارے میں لٹکتی ہوئی ان پوٹلیوں سے سخت چڑ تھی جن میں سورگ باش ہو جانے والے ہندوؤں کے پھول (مرنے والوں کی ہڈیوں کی راکھ) بھر کر رکھے جاتے تھے۔ ہندو تعداد میں بہت کم تھے' اس لئے مرتے کم تھے اور ہردوار بہت دور تھا' چنانچہ ہندو انتظار کیا کرتے تھے کہ دو تین ہندو مریں تو چندہ کر کے کسی ایک ہندو کو ان کے پھول دے کر گنگا میں بہانے کے لئے ہردوار بھیجیں۔ گیانو کھتریوں کی اس کفایت شعاری کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ ان کے منہ پر کہتا تھا۔ تمہاری جیب سے چار پیسے نہیں نکلتے تو اپنے سورگ باشیوں کے پھول مہینوں کیوں لٹکائے رکھتے ہو ان کی آدھی راکھ تو پوٹلیوں میں سے ہوا چرا کے لے جاتی ہے مقصد تو راکھ کو پانی میں ٹھنڈا کرنا اور ہمارے جنگل کی ندی کا پانی شیشے کی طرح صاف اور برف کی طرح ٹھنڈا ہے۔ گنگا کا پانی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ایک دن سکھ اور ہندو دکانداروں نے ایک سفید ریش کو تیار کر لیا تھا کہ وہ گیانو کے پاس جائے اور اسے سمجھائے کہ خانو اب معصوم بچہ نہیں ہے۔ بڑا ہو گیا ہے اور کچھ بھی ہو وہ مسلمان ہے اور ایک سوکھ کے گھر میں اس کا آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ سفید ریش سکھ سب کے کہنے پر چلا تو گیا تھا مگر گیانو کے سامنے ادھر ادھر کی ہانکنے لگا تھا گیانو شاید اس کا اعتراض سننے کے لئے تیار تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے پوچھا تھا سردار جی' فوجاں آج الٹی طرف چڑھائی کیوں کر رہی ہیں؟ آپ خانو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ جواب میں سفید ریش سکھ نے بھرشٹ کی بات چھیڑی تھی تو گیانو نے کہا تھا۔ سردار جی' پہلے یہ بتایئے' گورو گرنتھ صاحب میں بابا فرید کی رچنا اور بھگت کبیر کے شبد کیوں ہیں؟ وہ تو مسلمان تھے' گرنتھی جی سے آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دس ہزار میں ایک قرآن مجید خریدا تھا اور اسے چوم کر آنکھوں سے لگایا تھا' پھر بھی مہاراج کا دھرم قائم رہا تھا۔ سفید ریش جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ گیانو کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ ان باتوں کو چھوڑیئے سردار جی یہ بتایئے کہ گاؤں کا ایک کنواں ہے۔ اسی سے سکھ' ہندو اور مسلمان پانی بھرتے ہیں' ڈول سے ڈول ٹکراتے ہیں اور گھڑے سے گھڑا' آپ ہر روز ہی پانی پیتے ہیں جو آپ کی بہو بیٹی کنوئیں سے بھر کر لاتی

ہے لیکن آپ کا دھرم خراب نہیں ہوتا اور آپ میری زبان نہ کھلوائیں' جن لوگوں نے آپ کو بھیجا ہے میں ان کی جڑوں کو بھی جانتا ہوں' ان سے کہیں کہ پرمیشر کے پوتے نہ بنیں' پرماتما سے پیار کا رشتہ جوڑیں اور ایسی باتوں کا فیصلہ سچے بادشاہ پر چھوڑ دیں وہ پتہ نہیں آکاش پر بیٹھ کر کیا کچھ جوڑتا توڑتا رہتا ہے۔ سفید ریش چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ گیانو کی زبان بارہ ہاتھ کی تھی۔ اس کے منہ لگنا آسان نہیں تھا۔ لیکن اصل مسئلہ تو پانی تھا۔ پانی تو دھرم اپدیش سے زیادہ ضروری ہے۔ پانی نہ ملے تو نہ دھرمی رہے اور نہ دھرم اور پانی گاؤں کے واحد کنوئیں سے مل سکتا تھا۔ گیانو کا کنواں بھی تھا مگر وہ گاؤں سے ڈیڑھ دو کوس پر وادی میں تھا اور پھر گیانو کا مزارع بھی تو مسلمان تھا۔

خانو کی ڈھوک ایک پہاڑی کا چہرہ مہرہ بنی ہوئی تھی۔ پہاڑی کی چوٹی سے چند گز نیچے تھوڑی سی ہموار جگہ تھی۔ اسی پر خانو کے دادا اور باپ نے مل کر ڈھائی کمروں کی ڈھوک تعمیر کی تھی دور سے دیکھو تو ایسا لگتا تھا کہ ابوالہول کے مجسمے کا چہرہ چھوٹا ہو گیا ہے۔ ڈھوک کے دونوں طرف اونچی پہاڑیاں تھیں جو تیز ہوا کے سامنے باڑھ کا کام دیتی تھیں۔ سامنے وادی میں کھیت تھے اور پچھلی طرف جنگل تھا جو سبز آبشار کی طرح گرتا چلا گیا تھا۔ خانو روز صبح چٹانیں پھلانگتا ہوا اور کنکریاں اڑاتا ہوا گاؤں آتا تھا اور عصر کی اذان کے بعد واپس چلا جاتا تھا۔ ڈھوک میں صرف اس کا باپ رہتا تھا اور باپ نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ بیٹے سے نہ کچھ پوچھے گا اور نہ دیر سے آنے پر اسے کچھ کہے گا۔

گیانو کے گھر میں اس کی دو بیٹیاں رہتی تھیں وہ انہیں پیار سے جیتو اور چھنو کہتا تھا' گاؤں میں ان کے یہی دو نام مشہور تھے' ان کی ماں چھنو کی پیدائش برداشت نہیں کر سکی تھی' زچہ خانے سے ہی پرلوک سدھار گئی تھی۔ دائی نے گیانو کو دونوں خبریں ایک ساتھ سنائی تھیں' جواب میں اس نے آہ بھر کر صرف اتنا کہا تھا ہاں مائی قسمت کی تختی پر جو لکھا گیا ہے' اسے کون بدل سکتا ہے مگر گاؤں میں جس کسی کو گیانو کی پتنی کے سورگ باش ہونے کی اطلاع ملی تھی' اس نے بے اختیار کہا تھا' چلو پردیس کا عذاب کٹا' اسے گیانو ایسے ظالم سے نجات مل گئی۔

بیچاری پردیس کے آخری آٹھ دس مہینے بڑے عذاب میں کٹے تھے۔ اچھا بھلا گیانو اس کے لئے راکھشس بن گیا تھا۔ اسے چھابو اور چھنال کہہ کر پکارتا تھا اور گھر میں اس طرح قید رکھتا تھا جیسے وہ کوئی خطرناک مجرم ہے' ذرا آنکھ چوکی اور وہ فرار ہوئی اس نے دکان سے قیمتی بزازی بھی اٹھا دی تھی کہ صرف پردہ دار گھروں میں بکتی تھی اور ان میں کپڑا دکھانے اور بیچنے کے لئے اس کی پتنی ہی جا سکتی تھی اور ان گھروں میں نمبردار کا گھر بھی تھا۔ اس نے دالان کی دیوار بھی چھ رندے اونچی کرالی تھی کہ نمبردار کے چوبارے سے

پردہ رہے' لیکن نمبردار کے گراموفون کا ترم اور بابو کی لہکتی ہوئی تانوں بھرے ریکارڈ اسے دکان میں بھی چین نہیں لینے دیتے تھے نمبردار پر تو اس کا زور نہیں چلتا تھا مگر تپنی تو اس کا گھریلو معاملہ تھی' وہ اسے تھپڑ مارتا یا کوڑے یا اسے ہاتھ پاؤں باندھ کے الٹا لٹکائے رکھتا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ اس کے اندرونی مسئلے میں مداخلت کرے اور مداخلت کرنے کی جرات کسی میں تھی؟ ان دنوں گیانو جوانی کے زور میں تھا۔ اس کے داخلی معاملے کی بات ہوتی تھی تو لوگ دور سے ہی اس کے نام پر تھوک کے چلے جاتے تھے۔ چنتو اس کی بیوی کے پیٹ میں آ چکی تھی اور وہ بیچاری متلی کو روکنے کے لئے منہ باندھے پھرتی تھی۔ ادھر اس نے ابکائی لی اور ادھر گیانو نے ایک موٹی سی گالی سنائی۔ اس کی موت کے بعد گیانو کو سب نے سمجھایا تھا کہ اپنا گھر پھر سے بسا لو' دو معصوم بچیاں کیسے پالو گے؟ لیکن گیانو کو تو جیسے عورت کی بیوی ذات سے نفرت ہو گئی تھی۔

جیتو اور چنتو بہنوں سے زیادہ سہیلیاں لگتی تھیں' جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئیں اپنے اپنے ناک نقشے کے مطابق خوبصورت ہوتی گئیں' دونوں نے جسم شاید ماں کا پایا تھا۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہوتیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جیتو کون سی ہے اور چنتو کون سی؟ چوٹی سے لے کر ایڑی تک ان کی چھب ایک تھی۔ جیتو اگرچہ خانو کے سوا ہم سب سے ڈیڑھ دو سال بڑی تھی مگر ایک عمر کو پہنچنے کے بعد عمر کا فرق مٹ جاتا ہے ہم لوگ جب ماہیا گنگنانے کے قابل ہوئے تھے تو جیتو اور چنتو کی ناک میں اٹک ہوئے کوکے ایکا ایکی چمک اٹھے تھے۔ وہ سر پر تاپنے کی وہ دو گاگریں اٹھا کے ہرے بھرے کھیتوں میں سے گزرتی تھیں تو ایسا لگتا تھا کہ نکسن کے بمباروں اور پول پاٹ کے ہتیاروں کی آمد سے پہلے کمپوچیا کی دو شہزادیاں سروں پر مخروطی تاج سجا کر ٹہلنے نکلی ہیں۔

دونوں بہنوں میں ہم لوگوں کی دلچسپی صرف تفریح کی حد تک تھی گاؤں میں تفریح کے سامان ہی کتنے تھے؟ گلی ڈنڈے اور آنکھ مچولی ایسے کھیل تو پانچویں جماعت میں ہی ساتھ چھوڑ جاتے تھے۔ پرائے گدھوں پر سوار ہو کر خربوزے چرانے کا مشغلہ بھی زیادہ دن نہیں چلتا تھا' کسان کو خربوزے کے چھلکوں کے ساتھ صرف گدھے کے دو نیم کھروں کے نشان ملتے تھے مگر یہ نشان گاؤں تک پہنچتے تھے اور گاؤں شاہ ہر تو نہیں تھے کہ دو گھروں کی مشترکہ دیوار بھی دیوار چین بن جائے' کسی کو پڑوسیوں کی خبر ہی نہ ہو ہر کوئی اپنا اپنا معدہ اٹھائے دائیں بائیں بھاگتا ہوا دکھائی دے' گاؤں میں دوسرے ہی دن پتہ چل جاتا تھا کہ چور کون تھے؟ اس کے بعد بزرگوں کی تفریح شروع ہو جاتی تھی۔ وہ ایک ایک لڑکے کو بلا کر کہتے تھے شیطان کے چرخو بنتا ہے تو ڈاکو بنو للکار کے لوٹو یہ کہاں کی بہادری ہے کہ کسی کا گدھا چرایا اور غریب کسان کو سوتا دیکھ کر اس کا کھیت اجاڑ دیا' ڈاکو بننا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہر وقت مقتل میں رہنا پڑتا ہے' موت کو سینے سے لگا کر سونا پڑتا ہے۔ اس لئے خربوزوں کے ساتھ باجرے کے سٹے اور مکئی کے بھٹے بھی ہمارے آخری حملے کا انتظار

کرتے رہ گئے۔ علاقے میں کتوں کی لڑائی اور ریچھ کے ناچ کا "جلسہ" کبھی قسمت سے ہوتا تھا۔ بٹیر پکڑنے اور اس کی چڑیا ایسی جان کو لڑائی کے لئے تیار کرنے میں بڑا وقت لگتا تھا' اس تفریح کی خاطر سکول چھوڑنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد کیا رہ جاتا تھا؟ کبھی کبھار اگر کھیت خالی ہوں تو کبڈی کھیلنا یا بڑوں کے درمیان تاش اور والی بال کے مقابلے دیکھنا اور شام کو بزرگ اگر چوپال سے جلدی اٹھ جائیں تو چھلا چھپول کھیلنا بلاوجہ قہقہے لگانا اور مل کر گانا

واہ واوے چھلیا.......... دل ساڑ لیا

یا پھر سہ پہر کا انتظار جب لڑکیاں دانے بھنانے کے لئے بھٹیوں پر آتی تھیں یا سر پر گھڑے اٹھا کر پانی بھرنے کے لئے کنوئیں پر جاتی تھیں اور راستے میں اپنے اپنے "بوائے فرینڈ" پر مسکراہٹیں اچھال کر اس کا جی خوش کر دیتی تھیں' کئی لڑکے تو اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے رہ جاتے تھے۔ ان کا مقصد یہ سگنل دینا ہوتا تھا کہ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں' بے چاروں کا سلام لے کر جانے والا کوئی نہیں ہوتا تھا' کنوئیں میں سے لڑکیوں کی واپسی پر جب دونوں وقت مل رہے ہوتے تھے تو تفصیلی ملاقات کے لئے جگہ بھی طے کر لی جاتی تھی۔ خوش قسمت لڑکوں کو بھی اس مقام تک پہنچنے کے لئے کئی منزلیں طے کرنا پڑتی تھیں اور بہت سوں کی مرادوں کے دن چلہ کاٹنے میں ہی گزر جاتے تھے۔ بہر حال' تفصیلی ملاقات کے لئے دن تو کوئی بھی ہو سکتا تھا لیکن وصل کا وقت عموماً دوپہر کا ہوتا تھا' رات کو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون دیکھ رہا ہے؟ کون سا راز داں رقیب بن گیا ہے؟ کون سراغرساں کی طرح پیچھا کر رہا ہے اور کس کی لاٹھی یا کلہاڑی اٹھ رہی ہے؟ دوپہر شاید اس لئے بھی منتخب کی جاتی تھی کہ "عذر مستی" کے سہارے بھی "پیش دستی" کرنا مشکل ہوتا ہے سورج پر کھڑا اپنی کانی آنکھ سے گھورتا رہتا ہے۔

گیانو ایک گھاگھ آدمی تھا' وہ ضرور جانتا ہوگا کہ اس کی بیٹیاں جب پانی بھرنے کے لئے نکلتی ہیں تو راستے میں لڑکے جگہ جگہ چھاؤنی ڈال کے کیوں بیٹھے رہتے ہیں یا کوئی لڑکا سودا خریدنے آتا ہے تو اس کی نظریں تکڑی کی بجائے دکان کے عقبی دروازے پر کیوں لگی ہوتی ہیں جس کے پیچھے اس کی بانکی چچھاتی رہتی تھیں' وہ کسی لڑکے کے گھرک بھی دیتا تو اس کا اتنا رعب تھا کہ گاؤں کے سارے لڑکے دبک جاتے مگر وہ ایسی باتوں کا ذرا بھی برا نہیں مناتا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اندر سے خوش ہے کہ اس کی لڑکیاں ایسی خوبصورت نکل رہی ہیں کہ گاؤں بھر کے لڑکے ان پر لٹو ہو گئے ہیں' وہ ان کی شلوار اور کرتے کے لئے عموماً بڑے بڑے پھولوں والی چھینٹ یا "اکڑے" کے چمکتے ہوئے کپڑے چنتا تھا۔ یہ بات گاؤں کے آداب کے خلاف تھی۔ کنواری لڑکیاں صرف عید بقر عید اور شادی بیاہ کے موقع پر ہی چمکتے ہوئے کپڑے پہن کر اپنے آپ سے شرماتی رہتی تھیں' ویسے وہ ہمیشہ سادہ لباس پہنتی تھیں' تہمد

اور دوپٹہ عموماً کالے رنگ کا ہوتا تھا اور کرتا بھی کسی میل خورے رنگ کا بنایا جاتا تھا۔ جیتو اور چھنو اپنے لباس کی وجہ سے بھی اپنی ہم جولیوں میں نمایاں نظر آتی تھیں' دیکھنے والوں کی نگاہیں خواہ مخواہ پھسل کر ان پر جا گرتی تھیں۔

چھنو کی چہلوں کو گیانو اس طرح نظر انداز کر دیتا تھا' جیسے شہ دے رہا ہو کہ کچھ کر سکتی ہو تو کر کے دکھاؤ! لیکن جیتو کا کوئی انداز گروہ بدلا ہوا دیکھتا تھا تو دونوں بہنوں کو سامنے بٹھا کر عورت اور مرد کے بارے میں ایسی ایسی وضاحتیں کرتا تھا کہ دائیاں بھی سنتیں تو شرما جاتیں' وہ اپنی ناصحانہ گفتگو ہمیشہ اس ملے سے شروع کیا کرتا تھا۔ تم دونوں مجھے اپنی ماتا سمجھو اور سنو' ہم لوگ چھتوں کی منڈیر کے ساتھ لیٹ کر ان کا کھلا ڈھلا لیکچر سنتے تھے اور دیر تک گنگتے رہتے تھے' کسی کسی دن جیتو اور چھنو اپنی ماں کو یاد کر کے اس طرح تڑپ کے روتی تھیں جیسے انہیں بچھوؤں نے کاٹ کھایا ہے سارا محلہ گونج اٹھتا تھا گیانو تو گھبرا کر جیتو کو اپنے سینے سے لگا لیتا تھا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دلاسہ دیتا تھا۔ وہ چپ ہو جاتی تھی تو چھنو کی ہچکیاں خود ہی دھیرے دھیرے بند ہو جاتی تھیں اس کے بعد گیانو اپنی نصیحتوں کا پٹارہ کھول کے بیٹھ جاتا تھا۔

خانو عمر میں ہم سب سے بڑا تھا مگر گیانو کی محنت کی بدولت کلاس میں بھی سب سے آگے نکل گیا تھا' استاد صاحب کو یقین تھا کہ وہ ضلع میں اول آئے گا اور وظیفہ لے کر سکول کا نام روشن کرے گا' وہ کبھی کوئی بڑی سی غلطی بھی کر بیٹھتا تھا تو استاد صاحب اسے بس ڈانٹ دیتے تھے' اسی قسم کی غلطی اگر کسی اور لڑکے سے ہو جاتی تھی تو کچھ نہ پوچھئے' استاد صاحب کی چھڑی میں چابی بھر جاتی تھی۔ وہ مار پڑتی تھی کہ بندہ دے اور بچہ لے' گھروں میں آ کر شکایت کرتے تھے تو بتایا جاتا تھا کہ جسم کے جس حصے پر استاد صاحب کا تھپڑ یا ان کی چھڑی لگتی ہے وہ حصہ قیامت کے روز حساب کتاب کے بغیر ہی جنت میں چلا جائے گا۔ ہم لوگ یہ سوچ کر ہی خوش ہو لیا کرتے تھے کہ خانو کے جسم کا کوئی حصہ بھی از خود جنت میں جانے کے قابل نہیں ہے' اسے اپنے رونگٹے رونگٹے کا حساب دینا پڑے گا۔ اس وقت ہم نے یہ بات تو سوچی ہی نہیں تھی کہ ہمارے جسم کے بعض ٹکڑے اگر پہلے ہی جنت میں چلے گئے تو قیامت کے دن حساب دیتے وقت ہم کیا لگیں گے؟ گال اور ہاتھ تو ہوں گے ہی نہیں' پیٹھ کی کھال بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی ہو گی' ایک استاد کو گردن پر چٹکی بھرنے کی عادت تھی' سو ایک چوتھائی گردن بھی گئی' ایک ماسٹر صاحب کو شاگردوں کے ٹخنوں پر اپنے جوتے سے ٹھوکریں مارنے کی عادت تھی' اس لئے ٹخنے بھی آزاد ہو گئے اب پاؤں ایک طرف جائیں گے اور ٹانگیں دوسری طرف۔

وظیفے کے امتحان سے کچھ دن پہلے استاد صاحب چند لڑکوں کو رات کے وقت اپنے گھر میں پڑھاتے تھے۔ لڑکوں کا انتخاب صرف ذہانت اور لیاقت کی بنیاد پر ہوتا تھا استاد صاحب اس اضافی محنت کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ اس لئے کسی سے مرعوب بھی نہیں

ہوتے تھے۔ اس سال رات کی کلاس کے لئے خانو کا نام سرفہرست تھا مگر استاد صاحب نے اسے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں' وہ ایک دن گیانو نے اپنے پاؤں سے روند ڈالی تھیں' اس نے خانو کو جیتو سے چپک کر کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا' خانو گھبرا کر پیچھے ہٹا تھا تو گیانو نے اسے ایسا زوردار تھپڑ مارا تھا کہ اس کی آواز تیسرے گھر میں بھی صاف سنائی دی تھی' خانو اچھل کر پلنگ پر جا گرا تھا' اٹھا تھا تو ایک آہنی مکا اس کی گردن پر پڑا تھا۔ وہ لڑھکنی کھا کر دالان کے دروازے سے جا لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ گیانو کا پاؤں اس تک پہنچتا' اس نے تیزی سے کواڑ کھولا تھا اور اس سے ٹکراتا ہوا بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد جیتو کی ایسی پٹائی ہوئی تھی کہ وہ رونا بھول گئی تھی۔ بے سدھ پڑی دو جتڑ کھاتی رہی تھی۔ گیانو کھانا کھا کر ہمیشہ دکان میں چلا جاتا تھا۔ اس کی دوپہر دکان میں لیٹ کر ہی گزرتی تھی ظہر کی اذان سن کر وہ جیتو کو آواز دیتا تھا' دھی رانی' ذرا ستو تو لانا۔ اس روز خانو اور جیتو کی شامت آئی تھی کہ وہ دوپہر میں دکان سے نکل آیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مست تھے' لکڑی کی سیڑھی اور لوہے کی چٹخنی بھی انہیں خبردار نہیں کر سکی تھی۔ انہوں نے چھنو کو احتیاطاً پہرے پر کھڑا کیا تھا مگر اس وقت بخشو کہیں سے آ ٹپکا تھا اور وہ اس کی پاؤں باہوں میں چلی گئی تھی۔ اس دن چھنو کو بھی دو چار ہاتھ پڑ گئے تھے' دوپہر میں جھاڑا پھرنے کیوں گئی تھی۔

گیانو نے جیتو کو کوئی ایسی پٹی پڑھائی تھی کہ اس نے پھر کبھی خانو کا نام نہیں لیا تھا۔ خانو بھی گیانو کے گھر میں اپنا بستہ چھوڑ کر ایسا بھاگا تھا کہ پھر نہ سکول کا رخ کیا اور نہ گاؤں کا استاد صاحب تین میل پیدل چل کر اسے سمجھانے کے لئے اس کی ڈھوک تک گئے تھے مگر وہ انہیں پہاڑی چڑھتے ہوئے دیکھ کر جنگل میں جا چھپا تھا۔ اس کا باپ تو موجود تھا مگر اس سے کیا بات ہو سکتی تھی۔ استاد صاحب مایوس ہو کر واپس لوٹے تھے۔ خانو پڑھائی تو چھوڑ بیٹھا تھا مگر اپنے ساتھ ہم سب سے گیانو کا پیار بھی چھین کر لے گیا تھا' اب وہ نہ ہماری چھٹی کا انتظار کرتا تھا اور نہ ہی ہمارا منہ میٹھا کراتا تھا۔ ہم لوگ اس کی دکان کی چوکھٹ کو چھو بھی لیتے تھے تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہمیں گھورنے لگتی تھیں۔ کئی دنوں کے بعد جب اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑا تھا تو وہ ہم میں سے کسی ایک کو بلا کر پوچھ لیا کرتا تھا۔ خانو سے کبھی ملے' کیسا ہے وہ؟ ہم لوگ بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ اچھا ہے' آج کل ہل چلانا سیکھ رہا ہے۔ وہ آسمان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتا تھا۔ جہاں رہے' سکھی رہے' اس پر واہگوروکی کرپا رہے۔ اس جھوٹ کے معاوضے میں جو ریوڑیاں ملتی تھیں' وہ ہم لوگ آپس میں بانٹ لیتے تھے۔

خانو کے روٹھ جانے کے بعد گیانو تھوڑا سا مذہبی ہو گیا تھا' گرنتھی اس کا دوست تھا۔ مگر اب وہ گوردوارے کے اندر بھی اس کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ شبد کیرتن کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتا تھا اور شہر سے آنے والے گیانیوں اور بھائیوں کی ٹہل سیوا بھی کرتا تھا۔

ہندوؤں سے اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ اس کی دیومالا کو وہ ڈھکوسلے کہتا تھا۔ حالانکہ اپنی اپنی دیومالا ہر مذہب کا حصہ ہوتی ہے اور کم عمر ہونے کے باوجود سکھی بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ ان دنوں کسی ہندو کے گھر میں کتھا سنائی جاتی تھی تو گیانو بن بلائے بھی وہاں پہنچ جاتا تھا اور تھوڑی دیر تک چھوٹی سی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنا پگڑ جھکائے رکھتا تھا۔ مولوی صاحب بھی اس کی دکان میں آتے تھے تو بڑی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس وقت تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس پر یہ دورہ کس لئے پڑا ہے اور وہ کس بات کا کھوج لگانا چاہتا ہے لیکن بعد میں اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ قدموں کے نشان جب چاروں طرف پھیل جائیں تو ماہر سے ماہر کھوجی بھی چکرا جاتا ہے۔ وہ گھوم پھر کر اسی جگہ واپس آتا ہے جہاں سے قدموں کے نشان بکھرے تھے' گیانو تو سیدھا سادا آزاد آدمی تھا' کچھ دنوں بعد اپنی ڈگر پر واپس آ گیا تھا' اس کے بعد زندگی بھر نام کا ہی سکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑے بھی تھے تو صرف آسمان کے سامنے' کسی کو بھی ہاتھ جوڑ کر پرنام نہیں کیا تھا۔

خانو کا بستہ گیانو کی دکان کی ایک دیوار کی آنکھ بن گیا تھا' میلی سی خاکی آنکھ اس کی خاطر سودے کی پوٹلیاں اتار کر دیوار خالی کر دی گئی تھی' گیانو جب اپنی چنوری سے مصری کے تھال پر سے مکھیاں اڑاتا تھا تو ایک آدھ بار خانو کا متروکہ بستہ بھی جھاڑ دیا کرتا تھا' سب کے ساتھ گیانو کی عمر بھی بڑھ رہی تھی بلکہ وہ اب عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکا تھا' جہاں زندگی کی چمکتی ہوئی لکڑی کو وقت کا گھن برادہ بنانے لگتا ہے۔ گیانو کو اس حادثے کا اندازہ تھا' شاید اسی لئے کبھی کبھی اس کے منہ سے مایوسی کی کوئی بات اس طرح نکل جاتی تھی جیسے بچے کے ہاتھ سے بندوق چل جائے' وہ اپنی بات پر خود بھی حیران رہ جاتا تھا' بعد میں بیٹھ کر تاویلیں تراشا رہتا تھا لیکن کاغذ کے پھول دکھا کر بہار کو واپس نہیں ملایا جا سکتا۔

ایک نوجوان نے ہنسی ہنسی میں گیانو کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی تو اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تھا' ٹھیک کہتے ہو میرے چاند' بچہ اپنی جوانی اور جوان اپنا بڑھاپا نہیں دیکھ سکتا' جوانی' بچپن کا رسہ توڑ کر بھاگتی ہے اور بڑھاپے کو قبول نہیں کرتی' یہ وقت سب پر آتا ہے میرے چاند' تم پر بھی آئے گا' اس وقت تم بھی کہو گے کہ عمر بڑی ظالم چیز ہوتی ہے' بوڑھے کو اس کے بچپن اور اس کی جوانی کی مورتیں دکھا کر پریشان کرتی رہتی ہے' چھیڑنے والا نوجوان کھسیانا ہو گیا تھا مگر گیانو نے اسے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی' اس نے اپنی کراری آواز میں قہقہہ لگا کر کہا تھا یار' میں نے کیسی غلط بات کہہ دی ہے' بچپن کی تو کوئی عمر ہی نہیں ہوتی' اپنے نمبردار کو دیکھو' پچاس پچپن سال کا بچہ ہے۔

ان دنوں گیانو کے ساتھ ایک اور زیادتی ہوئی تھی' قریب کے ایک گاؤں میں ایک نووارد سکھ نے گیانو سے بھی بڑی ہٹی کھول لی

تھی' وہ جاپانیوں کے حملے سے چند دن پہلے ہانک کانگ سے بھاگ کر آیا تھا اور مشہور تھا کہ سیروں کے حساب سے سونا ساتھ لایا تھا' خانو کی ڈھوک اور اس کے اردگرد میل ڈیڑھ میل میں پھیلی ہوئی آٹھ دس ڈھوکوں کا رخ نئی دکان کی طرف مڑ گیا تھا۔ ان کے باشندے چیونٹیوں کی طرح چل کر نئی دکان سے کھانے کی چیزیں لانے لگے تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ چیونٹی بڑا بے روایت کیڑا ہے' جب دیکھو اپنا رخ بدلتی رہتی ہے۔ انسان نے شاید اسی سے یہ سبق سیکھا ہے کہ ایک در بند ہزار در کھلے' انسان مانے یا نہ مانے' اس کے استادوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ چیونٹی سے ہاتھی تک' مولے سے شہباز تک' جھینگے سے وہیل مچھلی تک اور پتہ نہیں کس سے کس کس تک؟ جس کسی کو جتنا کچھ معلوم تھا' اس نے انسان کو سکھا دیا اور انسان نے اس کی کمزوری کا پتہ چلا کر اسی کو زیر کر لیا حد تو یہ ہے کہ انسان نے جس پتھر سے دوسرے جانداروں کا شکار کیا' اسی پتھر سے اپنے بھائی کا بھی سر کچل دیا۔ بھائی کی لاش چھپانے کی ترکیب بھی ایک کوے سے سیکھی اور خود موصوف اب تک ایک طوطے کی بھی نہیں پڑھا سکے! اب تو طوطے' کوے' چیتے اور شیر بھی جاندان انسان کی دہشت گردی سے پناہ مانگتے ہیں۔

انسان نے بھی تو قتل کرنے کے آلات کے انبار لگا دیئے ہیں پہلے اس نے بچھو کے ڈنک ایسے نیزے بھالے تیار کئے' پھر کتے کی طرح بھونکتی ہوئی بندوقیں اور شیر کی طرح دھاڑتی ہوئی توپیں ڈھالیں اور اب تو اس نے ایٹم بم تیار کر لئے ہیں جو زرخیز زمین کی مٹی کو زہر بنا دیتے ہیں اور صحت بخش ہوا میں آگ لگا دیتے ہیں' ظلم یہ ہے کہ ایٹمی کھلونے بن مانس قسم کے چند آدمیوں کے ہاتھ لگے ہیں' وہ انہیں دکھا کے کبھی ایک دوسرے کو ڈراتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کا منہ چڑاتے ہیں۔ اگر کھیل کھیل میں کہیں ان کا دماغ پھر گیا تو کیا ہوگا؟ سب کچھ زیر و زبر ہو جائے گا۔ آسمان پر زہر بھرے بادل چھا جائیں گے' زمین کا کونا کونا برف سے ڈھک جائے گا اور ہر جاندار کی ہڈیوں کے ڈھانچے پر سے گوشت پگھل کر زمین میں جذب ہو جائے گا۔

انسان نے اپنی دعاؤں میں ہمیشہ ارضی اور سماوی آفات سے پناہ مانگی ہے' حالانکہ سب سے زیادہ انسانوں کی موت انسانوں کے ہاتھ سے لکھی گئی ہے' جنگ کے میدانوں میں' مقتلوں اور عدالتوں میں' معبدوں اور شفاخانوں' ویرانوں اور بازاروں میں انسان انسانوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوئے ہیں' کسی کو لوٹ کر مارا گیا ہے' کسی کو بھوک سے مارا گیا ہے اور کسی کو بے سود مارا گیا ہے۔ ایک کی رگ حیات پر خنجر چلا ہے تو دوسرے پر گولی' اکثر کی شاہ رگ ریتی سے رگڑ رگڑ کر کاٹی گئی ہے' نادر شاہ تو بھولا بادشاہ تھا' کہتا تھا میں عذاب الٰہی ہوں حالانکہ جس کے ہاتھ میں تیغ آئی' وہی دوسروں کو تہ تیغ کرنے لگا' اس عذاب تیغ میں ہے' نادر شاہ تو بس تیغ بردار تھا۔ اب بھی بہت سے چھوٹے بڑے نادر شاہ نام اور بھیس بدل کر جگہ جگہ تیغ چلاتے پھرتے ہیں۔ مگر وہ بڑے ہوشیار ہیں۔ اپنے آپ کو

''عذاب الٰہی'' نہیں کہتے۔ کہیں وہ نجات دہندہ اور محافظ کہلاتے ہیں' کہیں وہ مصلح اور معالج بن بیٹھتے ہیں' کہیں وہ عادل اور خادم کا روپ دھار لیتے ہیں اور کہیں اپنے آپ کو عزت' ایمان اور آبرو کے رکھوالے مشہور کر دیتے ہیں۔ ریڈیو' ٹیلی ویژن اور اخبارات انہیں کیسے ہی خوبصورت رنگوں میں پیش کریں' اندر سے وہ چھوٹے چھوٹے نادر شاہ ہی ہوتے ہیں جب تک ان کے ہاتھوں میں اتنی سکت باقی رہتی ہے کہ اپنی تیغ کو بے نیام رکھیں' اس وقت تک کمزوروں' بے کسوں اور بے نواؤں کے ساتھ سرکشوں' سرفروشوں اور بے لگاموں کے سر بھی قلم ہوتے رہتے ہیں۔

ارضی اور سماوی آفات نے بھی لاکھوں نہتے انسانوں کا خون پیا ہے' مگر ڈھائی تین ہزار سال کی موجودہ تاریخ میں صف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ صحرا نے پچاس ہزار ہتھیار بند انسانوں کو ایک ساتھ ہلاک کر دیا تھا۔ اتنے ہی بدنصیب امریکی ویت نام کی ایک جنگ میں مارے گئے تھے۔ یہ لشکر سائرس اعظم کے فرزند ارجمند نے اپنی سلطنت کی سرحدیں پھیلانے کے لئے بھیجا تھا۔ راستے میں صحرا بسیط پڑتا تھا' لشکری ابھی اس کا سر پیر ہی تلاش کر رہے تھے کہ صحرا نے اپنی کھربوں ٹن ریت میں سے چٹکی بھر سفوف لے کر ان کے منہ پر دے مارا تھا' دم گھٹ جانے کی وجہ سے پچاس ہزار کے پچاس ہزار فوجی وہیں ڈھیر ہو گئے تھے۔ ان کی مسلح لاشوں پر سے ہوا قہقہے لگاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ تلاش بسیار کے باوجود آج تک اس لشکر جرار کے کسی اسلحہ بردار کی ایک ہڈی بھی نہیں ملی۔

سائرس اعظم موجودہ ایران کے کسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ ان دنوں ملکوں کی کوئی حد یا سرحد نہیں ہوتی تھی' بلکہ ملک بھی نہیں ہوتے تھے۔ اکثر لوگ صرف اتنے علاقے کو ملک سمجھتے تھے جہاں وہ پیدل گھوم پھر سکتے تھے۔ ان کے لئے ملک ایک سب تحصیل سے بھی چھوٹے ہوتے تھے۔ اس دور میں سلطنتیں اور بادشاہ ہوتے تھے' بعض بادشاہوں کا حکم مشکل سے بیس میل لمبے علاقے پر چلتا تھا' پھر بھی وہ اپنے آپ کو ''ظل الٰہی'' کہلوانا پسند کرتے تھے۔ اپنے محرومہ علاقے کے لوگوں کو لوٹ کر ہیرے جواہرات جمع کرتے تھے اور اپنے غلاموں میں سے کسی ایک کی کھال اتروا کر اس میں بھس بھر کے خوش ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے قبائل اور سردار ہوتے تھے اور سردار کا وفادار بن کر ہی جان کی امان ملتی تھی ورنہ وہ کسی درخت سے رسی باندھ کے لٹکوا دیا تھا' اس سے بھی پہلے؟ لوگ اچھے بھلے اور ٹھیک ٹھاک ہوا کرتے تھے' مل جل کے رہتے تھے اور بانٹ کر کھاتے تھے' مگر یہ تو ہزاروں سال پہلے کی بات' اس وقت غداری اور وفاداری کے لفظ بھی نہیں بنے تھے' ملک تو بہت بعد میں بنے تھے اور حب الوطنی کی اصطلاح تو حال ہی ایجاد ہوتی ہے۔ خیر اب تو سائرس اعظم کی لاش کی طرح ایران میں بادشاہت بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو چکی ہے بلکہ ہزاروں ایسے نوجوان بھی گورغریباں میں دفن ہو چکے ہیں جنہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بادشاہت کا قصہ ختم کر دیا تھا پتہ نہیں اچھے بھلے اور دیکھتے بوجھتے آدمی ایک دوسرے

کے لئے سانپ اور بچھو کے کیسے بن جاتے ہیں؟ یہ کام شیطان ہی کا ہو سکتا ہے؟

گیانو کی نظروں میں نیا سکھ دکاندار بھی شیطان کا چیلہ تھا' اس کے بہکاوے میں آ کر گیانو کے چند گاہک اسے چھوڑ گئے تھے۔ اس وہ ان ڈھوکوں پر کیسے جا سکتا تھا' جہاں اس کا کوئی مقروض نہیں تھا۔ اس کی عزت تو ادھار کی ڈوری سے بندھی ہوئی تھی اور اسے اپنی عزت بہت پیاری تھی۔ وہ خاتو کو دور سے دیکھ لینے کے بہانے سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے سکھ حریف سے بہت خفا تھا وہ اگر گرنتھی یا گیانی ہوتا تو اپنے حریف پر خنجر ضرور چلاتا جو صدیوں سے کبھی اپنوں پر اور کبھی غیروں پر چلتا آیا ہے۔ پھر بھی اس کی دھار گیسوئے تابدار کی طرح آبدار ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ بھی پرمیشر کا افسر یکار خاص بن جاتا اور اپنے حریف سکھ کو دھرم تیاگی اور پنتھ بیری قرار دے کر سکھی ہے سے ہی نکال دیتا۔ ایسی حرکت اس کے مزاج کے خلاف تھی لیکن اس کا حریف سکھ شیطان صورت تھا اور شیطان سے لڑائی میں سب کچھ جائز ہے۔ انسان کے سینے پر چڑھ کر اس کا سرتن جدا کر دینا بھی' اس کے اندر چھپے ہوئے شیطان کو شکست دینے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ نہ ہوگا بانس اور نہ بجے گی بانسری' آسان سی بات ہے مگر کثرت استعمال کے باوجود بے اثر ہے' دراصل شیطان بڑی کتی چیز ہے' بیک وقت کروڑوں انسانوں کے اندر چھپ کر ان کی نازک غدودوں اور دکھتی رگوں کو چھیڑ رہتا ہے۔ انسان مر جاتے ہیں یا مار دیے جاتے ہیں اور شیطان سلامت رہتا ہے' دولت اور جائیداد کی طرح!

گیانو کے پاس نہ وہ سند تھی اور نہ خوردبین' جس کے ذریعے دوسروں کے اندر چھپے ہوئے شیطان کا پتہ چلایا جاتا ہے اور ہر ایرے غیرے اور نتھو خیرے کو بتایا جاتا ہے کہ وہ شیطان جا رہا ہے' اس سے لڑنا فرض ہے' گیانو کو اپنے گاؤں والے بھی واجبی سا سکھ سمجھتے تھے وہ کس برتے پر کسی کو دھرم کے دائرے سے خارج کر سکتا تھا؟ اس نے ایک دو بار یہ بھی سوچا تھا کہ نووار بیوپاری کی دکان اور گھر آگ لگوا دے' لیکن اس کو حریف بھی جہاندیدہ سکھ تھا' جاپانیوں کی چنگھاڑتی ہوئی فوج کو چکمہ دے کر یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے پہلے علاقے کے افسروں اور نمبرداروں سے تعلقات بنائے تھے اور لٹھ ماروں کو مٹھی میں کیا تھا' پھر دکان کا دروازہ کھول کر بوہنی کی تھی پہلے دن کی بکری کے پیسے پرشاد چکھوانے کے لئے گوردوارے میں دیے دیئے تھے' گڑ کی ایک دھڑی مسجد میں بھجوا دی تھی کہ بچوں اور نمازیوں میں بانٹ دی جائے اور شام کو گاؤں کے بزرگ کے مزار پر حاضری دے کر اپنے ہاتھ سے دیئے جلانے تھے۔ گیانو کہاں کہاں اس کا مقابلہ کر سکتا؟ یوں بھی آگ اور کرپان کے کھیل اب گیانو کے بس کے نہیں رہے تھے' وقت کا سرجن بہت کچھ کاٹ پیٹ کر پھینک کرتا ہے۔ سردیاں شروع ہوتی ہیں تو عجیب الطرفین قسم کی بھڑوں کے بھی زہر بھرے ڈنک جل جاتے ہیں۔ بچے ان کی دھاگے ایسی ٹانگوں میں دھاگہ باندھ کے انہیں پتنگ کی طرح اڑاتے پھرتے ہیں۔

سکول کے بعد ہم لوگوں کا ٹولو بکھر گیا تھا' موسم گرما کی چھٹیوں میں سب اکٹھے ہوتے تھے' سبھی جوان ہورہے تھے' جیتو بھی بڑی ہوگئی تھی' مگر چنتو تو پٹاخہ بن گئی تھی۔ یوں تڑاق تڑاق بولتی تھی جیسے بھٹی میں مکئی کے دانے بھن رہے ہوں۔ دونوں بہنیں ہم سے اس طرح ملتی تھیں جیسے بھٹی میں مکئی کے دانے بھن رہے ہوں' دونوں بہنیں ہم سے اس طرح ملتی تھیں جیسے ہم ابھی سکول میں پڑھتے ہیں اوران کے سامنے کے بچے ہیں۔ یہ ان کا وہم تھا' ہمارے لئے تو وہ پراسرار ہوتی جارہی تھیں' ہماری محدود محفلوں میں ان کی پنڈلیوں پر بھی گفتگو ہونے لگی تھی' جو شلواروں میں چھپی رہتی تھیں۔ ان دو بہنوں کے سوا گاؤں کی ساری لڑکیاں تہمد باندھتی تھیں اور تہمد میں سے ان کے گھٹنے تک جھانکتے رہتے تھے مگر ان کی طرف کوئی پلٹ کے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ صرف جیتو اور چنتو کی شلوار پوش پنڈلیاں تھیں جو لباس آرائی کا موضوع بنتی تھیں۔ انہوں نے ہمارے ایک ماچھی دوست کو اتنا برانگیختہ کردیا تھا کہ اس کے ارادوں کی بھنک اگر نمبردار کے کان میں نہ پڑتی اور وہ اسے آنکھیں نہ دکھاتا تو وہ ضرور کوئی غلط حرکت کرگزرتا۔

حضرت سلیمان کی اور بات تھی' وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کہیں ملکہ صبا کی پنڈلیاں بالوں سے داغدار تو نہیں ہیں؟ ملکہ صبا جس علاقے کی رہنے والی تھی' اس کی عورتوں کو ابھی تک پنڈلیاں کیا پیٹ چھپانے کے لئے بھی کپڑا نصیب نہیں ہے لیکن وہ تو ملکہ تھی' ہر وقت زربفت میں ڈھکی چھپی رہتی ہوگی۔ اس کی پنڈلیوں کا حال معلوم کرنے کے لئے انوکھی ترکیب آزمانا پڑی تھی۔ حضرت سلیمان کے ''دربار ہال'' میں آئینوں کا فرش لگایا گیا تھا اور آئینے اس ترتیب سے جوڑے گئے تھے کہ پہلی نظر میں لگتا تھا کہ پانی فرش پر چھپل کر کروٹیں لے رہا ہے ملکہ صبا کی آنکھیں بھی دھوکہ کھا گئی تھیں۔ دربار ہال میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنی پوشاک کو پانی سے بچانے کے لئے اٹھالیا تھا۔ اس کی پنڈلیوں کے بال آئینوں کے فرش پر کالے کالے کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے دکھائی دیئے تھے۔ درباریوں کے دم اوپر کے اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے تھے' تب حضرت سلیمان نے دعا کی تھی۔ ملکہ صبا کا حسن بے عیب ہوگیا تھا۔ اسکی پنڈلیوں پر سے بال جھڑ گئے تھے۔ اس واقعہ سے ثابت ہوگیا تھا کہ حضرت سلیمان بھی انسان تھے اور تجسس انسان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ وہ اس کے ذہن میں ہردم پارے کی طرح پھڑکتا رہتا ہے۔

جیتو اور چنتو کا وہ مسئلہ نہیں تھا جو ملکہ صبا کا تھا' انسان نے جستجو کی صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر بال صفا پوڈر ایسی چیزیں بھی تیار کرلی تھیں اور یہ چیزیں گیانو کی دکان میں بھی آگئی تھیں' وہ دراصل نہایت ذہین اور اداشناس تھیں' دیکھتے ہی بوجھتی تھیں' اس لئے ان کی شلواروں کے پائنچے لٹک کر ان کی ایڑیوں میں پھنسنے لگے تھے ان کی مشکل دیکھ کر استاد امام دین گجراتی کا یہ شعر بامعنی لگنے لگا تھا کہ

میری پنڈلیوں کو نہ چھیڑو

ان میں ہوتا ہے درد جگر مام دینا

جیتو اور چھنو نے اس درد کی سستی سی دوا ڈھونڈ لی تھی۔ انہوں نے ہم سب کے ناموں کے ساتھ بھائی کا دم چھلہ لگا دیا تھا۔ وہ ہمارے ماچھی دوست کو بھی بھائی کہنے لگی تھیں حالانکہ گاؤں میں صرف ماچھیوں اور دوسرے نیچی ذات والوں کا یہ فرض بنتا تھا کہ زمیندار اور کسان گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو بہن کر پکاریں اور انہیں دیکھ کر نظریں نیچی کر لیں۔

ہمارے ٹولے سے کٹ کر خانو میں الو والی خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں' وہ بے وقوف نہیں تھا' تنہائی پسند اور کم گو تھا' شاید سوچتا زیادہ تھا' اس لئے الگ تھلگ رہ کر خوش رہتا تھا ہم لوگ جب کبھی شکار کھیلنے جاتے تھے تو اس سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ بڑا خوبصورت نوجوان نکل رہا تھا۔ اپنے باپ کے بالکل برعکس! اس کا باپ تو بدصورتی کی ایک مثال تھا۔ اس کے چہرے سے ہردم کالک ٹپکتی رہتی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں اور ان میں تازہ گوشت کی دو بوٹیاں رکھی رہتی تھیں۔ جبڑا ماتھے کے برابر چوڑا تھا۔ داڑھی ایسی چھدری تھی جیسے فصل کو سوکھا مار گیا ہو البتہ مونچھیں گھنی تھیں اور سر کے آوارہ بال اس کے شانوں تک پھیلے ہوتے تھے۔ وہ کبھی کبھار جب کوئی بات کرتا تھا تو ہر شخص حیران ہو کر اسے یوں دیکھتا تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ یہ بھوتو بولتا بھی ہے؟ البتہ خانو کی ماں کے حسن کے قصے ہم نے بہت سنے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوہ قاف کی کوئی پری تھی۔ راجوں مہاراجوں کے محلات کے لائق تھی لیکن قسمت کی ہیٹی تھی کہ خانو کے باپ ایسے بدصورت ملنگ کے پلے باندھ دی گئی تھی۔ ماں نے اس مار پیٹ کے دلہن کا جوڑا پہنایا تھا اور بیٹے کے ساتھ مل کر روتی کرلاتی' دلہن کو ڈولی میں دھکیل دیا تھا۔ خیر مرنے کے بعد تو سبھی حسن و جمیل ہو جاتے ہیں مگر وہ ملنسار اور خوش اخلاق ضرور ہو گی۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی عورتیں بڑے پیار سے اس کا ذکر کرتی تھیں اور افسوس کے ساتھ کہتی تھیں۔ تاپ کا تو بس بہانہ تھا' وہ بیچاری تو ڈولی میں بیٹھتے ہی مر گئی تھی۔

تاپ کا واقعی بہانہ تھا' یہ راز ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوا تھا' خانو کی ماں کو بخار ضرور ہوا تھا مگر وہ تین میل چل کر گاؤں کے حکیم صاحب کو نبض دکھانے آئی تھی۔ اپنی کئی سہیلیوں کے گھر گئی تھی' گیانو کی دکان سے سودا سلف لیا تھا اور سر پر گٹھڑ لاد کر مسکراتی اور گنگناتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔ اس کا بھائی پہلے سے اس کی ڈھوک پر موجود تھا۔ بھائی کو دیکھ کر وہ حیران تو ہوئی ہو گی پر سوچتی ہو گی کہ کسانوں کے پاؤں میں تو چھرکیاں لگی ہوتی ہیں۔ ابھی یہاں اور ابھی وہاں' وہ یہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا ماں جایا ویرا اپنی اکلوتی بہن کے لئے پھانسی کا پھندا بن کر آیا ہے۔ رات کو اس کے شوہر اور بھائی نے مل کر اسی کے دوپٹے سے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا' ڈھوک ویرانے میں تھی' مرنے والی اگر چیخی بھی ہو گی تو اس کی آواز کہاں تک پہنچی ہو گی؟ دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے اس کا بھائی گاؤں آیا تھا تو

پاگلوں کی سی باتیں کر رہا تھا' وہ تو تلا اور ہکلا ہو گیا تھا' بہن کی موت کی خبر سناتے وقت یوں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے موت کو ساتھ لایا ہے۔ ماں نے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارنے سے پہلے اس کے منہ پر دو تھپڑ مارے تھے خانو کا باپ تو اس دن سے رات کی طرح خاموش ہو گیا تھا فاتحہ خوانی کے لئے اس کے ہاتھ بھی دوسروں کے دیکھا دیکھی اٹھتے تھے مگر دعا ختم ہونے سے پہلے ہی وہ انہیں اپنی چادر میں چھپا لیتا تھا' شاید ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی انگلیاں بڑھ کر اسکی آنکھیں نہ نکال لیں یا ہو سکتا تھا کہ اسے اپنی ہتھیلیوں پر اپنی بیوی کی ابلی ہوئی آنکھیں دکھائی دیتی ہوں جو دیئے کی روشنی میں رات بھر چمکتی رہی ہوں گی۔

گاؤں میں ایسے واقعات کہاں چھپے رہتے ہیں۔ بری باتوں کے معاملے میں لوگ عموماً پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں انہیں ہر جگہ اگلتے پھرتے ہیں' لیکن یہ تو فوجداری کا معاملہ تھا کسی کو کیا پڑی تھی کہ تھانے اور کچہریوں کے چکر کاٹتا پھرتا اور وہ بھی اپنے خرچ پر خانو کے باپ کی کسی سے دشمنی کیا رنجش بھی نہیں تھی' وہ محنتی قسم کا ملنگ تھا۔ اپنے کھیت کا کونا سیدھا کرنے کے لئے اس نے پہاڑ کا دامن کاٹنے میں آدھی عمر گزار دی تھی اور اس کے کھیت میں مشکل سے دس مرلے کا اضافہ ہوا تھا۔ اس سے بدلہ چکانے کے لئے کون قبر کھلواتا؟ نمبردار کو گیانو کی طرف سے خطرہ تھا مگر وہ بھی چپ رہا تھا' خاموشی ہی بہتر تھی' مرنے والی تو زندہ نہیں ہو سکتی تھی اور معصوم خانو کو باپ سے محروم کر کے کتنے نفلوں کا ثواب مل سکتا تھا؟ وہ بیچارا تو ویسے بھی ست ماسا تھا' بڑی دیکھ بھال چاہتا تھا۔

ماں کی موت کے وقت خانو کی عمر سال سوا سال ہو گی۔ اب تو وہ گھبرو جوان تھا' اس کا باپ بھی چپ کا روزہ رکھے رکھے ایک رات ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا تھا۔ اب شادی غمی میں خانو کو اپنے گھر کی نمائندگی کرنا پڑتی تھی۔ یہی مجبوری اسے چھ سات بار گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹ لاتی تھی۔ واپسی پر وہ پیاری پیاری کلیوں ایسے کئی دل بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ چند رشتے اس کی ڈھوک تک پہنچے تھے مگر اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ گاؤں میں آتا تھا تو اس گلی سے بچ کے نکل جاتا تھا جس میں گیانو کی دکان کی باغ بردار دروازہ کھلتا تھا۔ ماموں سے کہیں مڈبھیڑ ہو جاتی تھی تو وہ فوراً پیٹھ پھیر لیتا تھا۔ گیانو نے اسے چار پانچ مرتبہ دیکھا تھا مگر دور سے قریب جا کر اپنی چھاتی ٹھنڈی کرنا چاہی تھی تو وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔

گیانو ہمیشہ سے شادی بیاہ کی رسموں کا دلدادہ تھا' کہا کرتا تھا یار' زندگی میں ایسا موقعہ ایک دو بار ہی آتا ہے۔ جب چھوٹا آدمی بھی پھیل کر بڑا ہو جاتا ہے۔ سارے گاؤں کو کھانا کھلاتا ہے۔ اس کے نام کے گانے گائے جاتے ہیں۔ اس کے دروازے پر شہنائیاں بجتی ہیں۔ لیکن اپنا موقعہ آیا تھا تو گیانو سمٹ کر بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔ اس نے چپکے سے اپنی دونوں بیٹیوں کے رشتے پکے کر دیئے تھے۔ سگائی اور شگنوں کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شادی کا دن بھی خفیہ رکھا تھا۔ گرنتھی کو صرف ایک ہفتہ

پہلے اطلاع کی تھی' اسے بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ لڑکے کون ہیں' کیا کرتے ہیں اور باراتیں کہاں سے آرہی ہیں؟ وہ ہر سال کا ایک ہی جواب دیتا تھا' رب جو ملادے وہی جوڑی ہوتی ہے۔

شادی کا سن کر مراثنیں سہاگ کا گیت گاتی ہوئی آئی تھیں' لیکن گیانو نے گھر میں ڈھولک نہیں دھرنے دی تھی۔ مراثیوں کو پیسے پکڑا کر دروازے سے ہی رخصت کر دیا تھا کہ "بن ماں کی بچیاں ہیں' نہ کوئی ماسی ہے اور نہ پھوپھی' ڈھولک بجے گی تو اور دکھی ہوں گی" شجرہ گانے والے بھاٹ بھی آئے تھے۔ گیانو نے انعام دے کر ان کا منہ بھی بند کر دیا تھا۔ خاندانی شجروں پر گیانو کا اعتماد ہمیشہ ڈولتا رہتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ قلمی آموں کے بارے میں کون جانتا ہے کہ شاخیں کس کی ہیں اور جڑیں کس کی؟ لوگوں کا خیال تھا کہ گیانو میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنا نسب نامہ سن سکے۔ اس کا دل تو یہ سوچ کر بھی ہول کھاتا ہوگا کہ وہ اپنے خاندان کا آخری آدمی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے نسب نامے کی پوتھی ختم ہو جائے گی۔ اس جیسا آدمی یہ بات کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ بھاٹ اس کا خاندانی شجرہ گائیں اور اس کے نام پر آکر اس طرح رک جائیں جیسے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کے سامنے اچانک بڑا سا کھڈا آگیا ہے۔

یہ بھی نکتے کی بات تھی کہ بیاہ تو بیٹیوں کے ہو رہے تھے۔ شادی کے بعد بیٹیاں اپنے شوہروں کے خاندانی درخت کی کھاد بن جاتی ہیں' چاہے وہ ملکہ نور جہاں ہی کیوں نہ ہو۔ شجرے تو صرف بیٹوں کے بل پر چلتے ہیں اور گیانو کے گھر میں کوئی بیٹا نہیں تھا۔

جیتو اور چنتو کے لگن ایک ہی دن بھگتا دیئے گئے تھے۔ دونوں کے سسرال ایک دوسرے سے بھی چار چار ضلع دور تھے اور میکے سے بھی' گیانو نے پتہ نہیں کیا سوچ کر انہیں فاصلے کی ماردی تھی' مگر اب وہ خود بھی سزا بھگت رہا تھا۔ اس کی کرار آواز جو اڑوس پڑوس کے مکانوں میں گھومتی رہتی تھی' آہستہ آہستہ بیٹھ گئی تھی۔ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو جھڑک رہا ہے۔ پڑوسی کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے تھے مگر ایک لفظ بھی ان کے پلے نہیں پڑتا تھا۔ صرف یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ مکان اور دکان مل کر گیانو کو چبا رہے ہیں۔ وہ کوئیں کے مینڈک کی طرح اپنے گھر کی دیواروں میں قید ہے۔ مینڈک کتنا ہی زور مارے' کہاں تک اچھل سکتا ہے؟ چھلانگ لگا کر پانی میں ہی گرتا ہے۔

دکان میں کسی گاہک عورت سے باتیں کرتے وقت اس کی آواز میں کبھی کبھی جوانی کا ہلکا سا جھونکا آجاتا تھا ورنہ صبح ارداس کرتے وقت بھی اس کی آواز کی ایک ایک لہر کپکپاتی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ موسمی بخار میں مبتلا ہے۔ اس نے شام کی سیر تو ترک کر دی تھی مگر اپنے کولہے کے ساتھ کرپان کو ملکاتا ہوا وہ اپنے کوئیں پر ضرور جاتا تھا اور خوش ہو کر اشنان کرتا تھا۔ اس کے قدم اب چھوٹے ہو گئے

تھے۔اس کی دکان کے کھلنے کا وقت رفتہ رفتہ ڈھل رہا تھا۔سب لوگ دیکھ رہے تھے کہ گیانو کا دیا بجھ رہا ہے۔روشنی سے زیادہ دھواں دینے لگا ہے۔

ایک دن اطلاع ملی کہ گیانو کے دونوں داماد گرمیوں کے چند دن گزارنے کے لئے گاؤں آرہے ہیں۔ان کا تو کسی کو انتظار نہیں تھا کہ وہ سکھ ہی ہوں گے۔البتہ جیتو اور چنو کو سہاگنوں کے روپ میں دیکھنے کے سب مشتاق تھے۔وہ دونوں کجاوخ میں بیٹھی تھیں اور اونٹ قدم قدم پر گھنگرو بجا کر ان کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ان کے شوہر ساربان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے مگر گاؤں میں داخل ہوتے ہی وہ کھسک کر اونٹ کے پیچھے ہو گئے تھے۔گیانو نے ان کے لئے کوئی سواری نہیں بھیجی تھی گھوڑے مانگے جا سکتے تھے اور خچر کرائے پر ملتے تھے بھیجنے کو تو ایک اور اونٹ بھی بھیجا جا سکتا تھا مگر گیانو اپنے دامادوں کو شاید یہ سبق سکھانا چاہتا تھا کہ سسرال آنا آسان نہیں ہے پچیس میل تک کھٹارہ بسوں میں جھولے کھانے کے بعد دس میل پیدل چلنا پڑتا ہے ریل کا سفر اس کے علاوہ ہے۔

جیتو اور چنو استقبال کرنے والی عورتوں سے ملیں تو ایسا لگا کہ انہوں نے دوپٹوں کی طرح مزاج بدل لئے ہیں۔جیتو اب چمکتی دمکتی چھیل چھبیلی تھی' مٹک چٹک کر باتیں کرتی تھی' نکھار نکھار کے سب کی خیریت پوچھتی تھی۔اس کے برعکس چنو چپ چپ اور دبی دبی سی تھی۔چند مہینوں میں ہی بوڑھیوں کی طرح سنجیدہ ہو گئی تھی۔گھر سے کم ہی نکلتی تھی۔بخشو کی ماں کے پاس افسوس کرنے بھی نہیں گئی تھی۔ اس کی طرف سے پرسہ دینے کا فریضہ بھی جیتو نے ادا کیا تھا۔

بخشو اپنی ماں کو افلاس سے آزاد کرانے اور نمبردار کے نمبر بڑھانے کے لئے فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔اس کی عمر تو کم تھی مگر اس کا تعلیمی سرٹیفکیٹ نمبردار نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔نمبردار کو بھرتی ہونے والے لڑکوں کی عمر اور وزن بڑھانے کی ترکیب معلوم تھی' جن لڑکوں کی ابھی مشکل سے مسیں بھیگ رہی ہوتی تھیں' نائی سے صبح شام ان کی شیو بنوائی جاتی تھی۔بے درد نائی کند استرے سے نازک چہروں پر اس طرح کھروچے لگاتا تھا کہ داڑھی کے حاشئے پر جگہ جگہ سفید کھرنڈ بن جاتے تھے' جن لڑکوں کا وزن کم ہوتا تھا' ان کے گھر والوں سے کہا جاتا تھا کہ ایک پاؤ گھی ہر روز چھورے کے پیٹ میں پہنچنا چاہئے' اس طرح نو دس سیر گھی تو گل ہو جاتا تھا' لیکن بھرتی کے لئے لڑکے کا وزن پورا نکلتا تھا۔اس کے بعد ریکروٹنگ سٹاف قد اور چھاتی ناپتا تھا۔مرغی کی چونچ ایسی ناک والا ریکروٹنگ افسر نمبردار کی خدمات کو سراہتا تھا اور بھرتی ہو جانے والے ہر لڑکے کے گھر میں مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔چند مہینے گزرتے تھے تو لڑکے کے ماں باپ شہر سے آنے والے ہر شخص سے پوچھتے تھے تم تو لاہور سے آئے ہو جنگ کی سناؤ کب بند ہو رہی ہے؟ ماہیے کی ایسی کلیاں سن کر ان کی آنکھیں تر ہو جاتی تھیں کہ

ٹر گیا ڈھولا کر گیا گلے گراں ماہیا

جتھے ماہی یاد آوے' اتھے بہ کے رو لینا

گاؤں میں صرف گیانو کو نمبردار کی یہ حرکت بری لگتی تھی۔ وہ بھرتی کے لئے تیار کئے جانے والے لڑکوں کو بلا بلا کر کہتا تھا۔ میرے چاند کے ٹکڑو' جنگل میں جا کے سنو' ایک ایک درخت ہٹلر' ہٹلر پکار رہا ہے' مت جاؤ' فوج میں غریب کے بچو' بھون ڈالے جاؤ گے' اس کے مشورے پر کوئی بھی کان نہیں دھرتا تھا۔ جنگ کی وجہ سے بڑھتی ہوئی مہنگائی لوگوں کو اندھا کر رہی تھی اور گاؤں میں تقسیم ہونے والے منی آرڈروں کی روز افزوں تعداد حفیظ جالندھری کے اس گیت میں رنگ بھرتی رہتی تھی کہ

میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے

اور بیچارہ بخشو بھی بھرتی ہو گیا تھا' اسے بھی گیانو نے روکا تھا۔ نمبردار کو ہمیشہ کی طرح گیانو پر سخت غصہ بھی آیا تھا' اس نے پھر سوچا تھا کہ بہت ہو چکی' اب گیانو کی شکایت کر کے اسے ڈیفنس رولز کے تحت جیل بھجوا دینا چاہئے لیکن یہ سوچ کر اس نے اپنا فیصلہ پھر تبدیل کر لیا تھا کہ گیانو قید ہو گیا تو چھنو کا کیا بنے گا؟ جیتو کیا کرے گی؟ اس نے گیانو کو داڑھی کو جلتی ہوئی موم بتی دکھانے کی کوشش کی تھی مگر خانو تو پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا تھا۔ اپنی ڈھوک' ڈھور ڈنگروں اور کھیتوں میں خوش تھا۔

جیتو اور چھنو کی آمد سے کچھ روز پہلے گاؤں میں ایک بلکہ ایک اور ماتمی تار آیا تھا۔ بخشو اٹلی میں کسی جگہ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں کی بیچاری بڑھیا کہیں سسکتے کی حالت میں نہ چل بسے' اس کی زندگی سے تو کسی کو دلچسپی نہیں تھی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جوان موت پر بین کئے بغیر مر جائے' یہ بیٹا تو اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ اس نے چکی پیس پیس کر چھ ماہ کے یتیم بچے کو اتنا بڑا جوان بنا دیا تھا کہ وہ اپنے وطن اور تین سے ہزاروں میل دور جا کر جرمنوں سے جا بھڑا تھا۔ میت تو موجود نہیں تھی۔ عورتوں نے ایک خالی چارپائی کے گرد گھوم گھوم کر سیاپا کیا تھا۔ جب الاہنیاں اور نئے پرانے بین بھی بڑھیا کو رلانے میں ناکام رہے تھے تو ایک عورت بخشو کی اکلوتی تصویر اٹھائی لائی تھی۔ تصویر میں بخشو فوجی وردی میں ایک اونچے سٹول کے ساتھ کندھا جوڑ کر ''اٹنشن'' کھڑا تھا۔ سٹول پر ایک بیوہ کی حسرتوں کا سدا بہار گلدستہ سجا ہوا تھا۔ تصویر دیکھ کر بخشو کی ماں اتنے زور سے چیخی تھی کہ گاؤں کی زمین دہل گئی تھی۔ اس کے بعد عمر بھر اس کی آنکھیں خشک نہیں ہوئی تھیں وہ ہر وقت اپنی موت کی دعائیں مانگتی رہتی تھی اور زندگی اس کی دعائیں چن چن کر چھپاتی پھرتی تھی۔

گیانو نے جیتو کے جہیز پر بہت کچھ لٹا دیا تھا مگر چھنو کو کپڑوں کے چند جوڑے' تین زیور اور تھوڑی سی نقدی دے کر رخصت کر دیا

تھا۔ لڑکے والے تو اس سے بھی کم پر راضی تھے مگر نمبردار خاموش نہیں رہ سکا تھا۔ وہ بھری چوپال میں بول پڑا تھا۔ عجیب باپ ہے' دو بیٹیوں سے ایک سا سلوک نہ کر سکا۔ چنو کا جہیز بنانے وقت ڈنڈی مار گیا' بڑا خالصہ بنا پھرتا ہے' اصل میں تو بنئے کا بنیا ہے۔

جیتو اور چنو کے مزاج بدلنے کی وجہ اس سے کہیں بڑی تھی' گیانو نے جیتو کے لئے خوب ٹھوک بجا کر ایک پڑھا لکھا سکھ ڈھونڈا تھا۔ وہ کسی خالصہ کالج میں پڑھاتا تھا اور گیانو کی طرح ماسٹر تارا سنگھ کی سیاست کا مخالف اور بابا رام سنگھ کے کوکوں کا مداح تھا۔ وہ ستار بھی خوب بجاتا تھا۔ راگوں کے بارے میں گاؤں کے لوگ الف کے نام بے نہیں جانتے تھے لیکن وہ جب ماہیئے اور دوہے کی دھنیں بجاتا تھا تو آہا اور واہ وا کی صدائیں اس پر پھوار بن کے گرتی تھیں۔ اگر رات ہوتی تھی تو عورتیں بھی چھتوں پر چڑھ جاتی تھیں اور گٹھڑیاں بن کر ستار کے سروں کے ساتھ جھومتی رہتی تھیں' وہ جنگنی کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہاں ماہیئے کا رواج نہیں تھا۔ اس کی ستار بھی بتا رہی تھی کہ وہ جیتو کو دیکھ کر جیتا ہے' اس نے ماہیئے کی ایسی کلیاں جیتو سے ہی سیکھی ہیں جو گیانو کبھی گنگنایا کرتا تھا۔

''اک جند یوسف دی سارا مصر و پاری اے''

''دکھیاں بندیاں دا کوئی وکھرا شہر ہووے''

''جند مینڈی بکرا تے عمر کہندیاں گزری آ''

جیتو کے دولہے کے مقابلے میں چنو کا پتی الٹی کھوپڑی کی چیز تھا' ایک قصبے میں دکان کرتا تھا اس لئے حساب کتاب میں تو ٹھیک ہی ہوگا مگر دوسرے معاملوں میں کاٹھ کا الو تھا' سکھ نہ ہوتا تو اور بدصورت لگتا۔ ساون کی جنگلی گھاس کی طرح پھیلی ہوئی داڑھی چہرے کے کئی عیب تو چھپا لیتی ہے مگر کسی کی کم عقلی پر پردہ نہیں ڈال سکتی' اسے پہلوانی کا شوق تھا اور جس پہلوان نے اسے اپنے پٹھوں میں شامل کیا تھا۔ اس نے بھی غریب کو بے وقوف بنایا تھا' وہ اکھاڑے میں اترتا تھا تو او دبلاؤ کی طرح ہوا میں پنجے مارتا تھا اور خود ہی چکرا کے گر پڑتا تھا۔ اٹھتے وقت اسے اپنا وزن اٹھانا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ گیانو کے دامادوں میں اتنا بڑا فرق دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے تھے۔ گیانو نے جو سلوک چنو کے ساتھ کیا تھا۔ وہ تو کسی بے رحم بادشاہ نے اپنی مقتول ملکہ کی منہ پھٹ بیٹی سے بھی نہیں کیا ہوگا' وہ دونوں جب گاؤں میں آئے تھے تو دو دن تک اپنے سسر کے گھر میں دبکے پڑے رہے تھے۔ صبح گیانو کے ساتھ اس کے کنویں پر اشنان کرنے جاتے تھے۔ اس کے پیچھے مودب ہو کر چلتے تھے اور راستے میں گوروؤں کے نام کی مالا جپتے جاتے تھے۔ واپسی پر وہ دریکھ کی داتن چباتے ہوئے اور اس کی کڑواہٹ تھوکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے' تیسرے دن جیتو کی آواز کا شعلہ لپکا تھا۔ تم سارا دن

میرے کولہے سے لگ کر کیوں بیٹھے رہتے ہو مرد ہو مردوں میں جا کے بیٹھو آدمی آدمیوں میں ہی اچھا لگتا ہے یہاں تمہیں کوئی نہیں کھائے گا۔ سب بڑے اچھے لوگ ہیں۔ اس نے آخری جملے اتنی بلند آواز میں ادا کئے تھے کہ وہ گلی میں پہنچ کر پورے گاؤں میں بکھر گئے تھے' انہیں سن کر سب لوگ خوش ہوئے تھے' سہ پہر کو جب جیتو کا شوہر چوپال پر آیا تھا تو سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اس کے احترام میں حقہ بھی اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا وہ بھی سب میں گھل مل گیا تھا۔

دوسرے روز وہ چنتو کے شوہر کو بھی ساتھ لایا تھا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے ڈرا ڈرا کر روکا گیا ہے اور روکنے والا چنتو کے سوا کون ہو سکتا تھا؟ وہ آتے ہی چوپال کا چٹکلہ بن گیا تھا۔ بیچارے کی چال تک بھینگی تھی کسی کسی وقت شبہ ہوتا تھا کہ وہ اتنا احمق نہیں ہے ہیملا ہے' بنتا ہے لیکن بات بے بات' جب اس کی بے ہنگم ہنسی بے لگام ہو جاتی تھی یا شریر لڑکے جب اس کے کیس پکڑ کر اسے گاؤں کے تالاب میں غوطے دیتے تھے اور وہ دریائی گھوڑے کی طرح پانی میں سر نکال کر گنگنی گنتا تھا تو شبہ دور ہو جاتا ہے۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو جاتی تھی جب نوجوان اس کے گرد گھیرا ڈال کر گاتے تھے۔

ٹیڈے روپ نے ٹیڈی چال نے

ہر پاسے دھماں پائیاں

اور وہ درمیان میں ریچھ کی طرح ناچتا تھا وہ واقعی عقل کا پورا تھا۔ گاؤں میں صرف ایک نمبردار تھا جو اس سے اچھی طرح بات کرتا تھا۔ اس کی موجودگی میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس بھونڈے سکھ کا مذاق اڑائے۔ وہ نوجوانوں کو علیحدگی میں سمجھاتا تھا۔ گیانو کے دونوں داماد گاؤں کے مہمان ہیں اور مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ ان کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ صبعد میں جیتو دو بار گرمیاں گزارنے کے لئے گاؤں آئی تھی مگر چنتو نے گاؤں کی طرف پلٹ کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ جیتو کو کئی بار یہ اصرار کرتے ہوئے بھی سنا گیا تھا کہ باپو چٹھی لکھ کے چنتو کو بلا لو اس سے ملنے کو بڑا جی چاہ رہا ہے۔ گیانو اس کی فرمائش ٹال جاتا تھا' اگر زیادہ ضد کرتی تھی تو برہم ہو کر کہتا تھا۔ ایسا ہی پیار ہے تو چار پیسے خرچ کرو اور اس کی طرف سے ہوتی ہوئی چلی جاؤ۔ ہاں جیتو کبھی خانو کا نام لے لیتی تھی تو گیانو کی آواز پر سے بلغم کا بوجھ اتر جاتا تھا۔ وہ خانو کی جوانی' اس کی محنت اور اس کی بہادری کے جھوٹے سچے قصے دہرانے لگتا تھا۔ اس کی تان ہمیشہ اس افسوس پر ٹوٹتی تھی کہ وہ خوش بخت تو تمہاری شادی میں بھی نہیں آیا تھا' نائی کو تین بار بھیجا تھا' لیکن وہ اسے برا بھلا کہہ کر بھگا دیتا تھا' میری کتنی آرزو تھی کہ وہ تمہارے سر پر ہاتھ رکھتا اور تمہیں سہارا دے کر ڈولی میں بٹھاتا مگر۔

جو لوگ تھانیدار کے حکم پر گیانو کی لاش لپیٹ کر لائے تھے ان کا کہنا تھا کہ کلہاڑی کا وار پیچھے سے کیا گیا تھا' قاتل بڑا اشبہ زور تھا۔

کلہاڑی ہنسلی اور پسلی کو کاٹتی ہوئی پھیپھڑوں میں اتر گئی تھی۔ گیانو منہ کے بل گر پڑا تھا۔ اس کی گردن ذرا سی مڑی ہوئی تھی شاید اس نے قاتل کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی سفید داڑھی کا ایک حصہ اس کے لہو سے رنگ گیا تھا' باقی خون زمین پی گئی تھی۔ ایک دو محفلوں میں یہ سوال بھی اٹھا تھا کہ گیانو گاؤں سے تین میل دور کیا لینے گیا تھا؟ وہاں تو اس کا کوئی مقروض نہ تھا اور گاؤں میں اس نے وصولی شروع ہی نہیں کی تھی' جواب میں محفل خاموش رہتی تھی۔ شاید ہر شخص کو گیانو کی ران پر رکھی ہوئی بہی میں اپنے نام کا کھاتہ دکھائی دینے لگا تھا۔

گیانو کے قتل کی خبر سن کر گرنتھی نے سوچا تھا کہ اس کی بیٹیوں اور دامادوں کو اطلاع کر دے' دنیا میں وہی چار تو اس کے رشتہ دار تھے مگر ان دنوں تو ہر طرف قبریں کھدر رہی تھیں' چتائیں بھڑک رہی تھیں۔ بہت سے مرنے والوں کو نہ قبر نصیب تھی اور نہ چتا' گدھ اور چیلیں اتنی دلیر ہوگئی تھیں کہ انسانی لاشوں سے بوٹیاں نوچ کر نگل رہی تھیں نہ تار کا کوئی اعتبار تھا اور نہ ریل اور بس کا! انگریز سرکار تو جیسے اپنی ساری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگئی تھی۔ اس کی افواج ہٹلر' مسولینی اور ٹوجو کے ٹڈی دل لشکروں کو تتر بتر کرنے کے بعد کہیں اپنی تھکن اتار رہی تھیں' صرف اس کا جھنڈا شہر شہر اور چھاؤنی چھاؤنی میں لہرا رہا تھا' مقامی پولیس اور دیسی فوج کے چاق و چوبند دستے روز اس کی سلامی اتارنے تھے اور صبح و شام بگل بجا کر اعلان کرتے تھے کہ ''حکومت انگریز کی' حکومت انگریز کا' ملازم انگریز کے''

گھروں میں محبوس عورتیں اپنے بچوں کو سینے سے لگائے گھر کے فرنیچر کے ساتھ جل رہی تھیں' ان کی آہ و فغاں سے آسماں لرز رہے تھے مگر انگریز سرکار چپ چاپ کھڑی یوں تماشہ دیکھ رہی تھی جیسے وہ سب کی سب جون آف آرک ہیں' فرانس کی آزادی کے خواب دیکھنے والی' برطانیہ کی بالادستی کو برا کہنے والی' اپنے ناجائز بھائی' نہیں بھائی تو ناجائز نہیں ہوتے' سوتیلے ہوتے ہیں۔ اپنے سوتیلے بھائی کی تاجپوشی کی طلبگار اور کلیسا کے سیاہ پوش پادریوں کے فتوے کی رو سے ایسی کافرہ جسے جل کر مرتے ہوئے دیکھنا بھی کار ثواب تھا۔

ماؤنٹ بیٹن' آکلنک' ریڈ کلف ایسے ناموں کے برطانوی گماشتے شاہی برانڈ کی وسکی سے سرشار ہو کر تلے ہوئے تلور اور بھنی ہوئی مرغابیاں چاندی کی چھریوں اور کانٹوں سے تراش رہے تھے۔ ان کے سامنے مفتوحہ جرمنی اور پامال فرانس کی وائن کے پیالے سجے ہوئے تھے اور وہ پسماندہ اور غلیظ دیسی لوگوں پر ترس کھا کر ہنس رہے تھے' دو سو سال میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ برطانیہ کی سب سے بڑی نوآبادی کے کسی کونے کھدرے میں بھی انگریز حاکموں کے خلاف کوئی نعرہ بلند نہیں ہو رہا تھا!

دوسروں کی چھریاں تو بغل میں تھیں مگر ماسٹر تارا سنگھ ہوا میں کرپان لہرا کر کہہ رہے تھے "اب اس سے فیصلہ ہوگا" ماسٹر جی کی کرپان کبھی انگریز کے خلاف بے نیام نہیں ہوئی تھی۔ انگریز ایسے بے مروت نہیں تھے کہ جاتے جاتے ماسٹر جی کو جیل میں بند کر دیتے اور پھر برطانیہ کو اپنی دولت مشترکہ بنانی تھی۔ انہیں صرف اس کے لئے راستے تیار کرنے کا فرض سونپا گیا تھا' باقی کام اب وہی لوگ جانیں اور وہی نیڑیں۔

گرنتھی نے سوچا تھا کہ نفانفسی اور مار دھاڑ کے اس ماحول میں گیانو کے داماد نہ جانے کہاں ہوں گے؟ اپنے اپنے گھروں میں چھپ کے بیٹھے ہوں گے یا دوسروں کے گھروں کے جلنے کا تماشہ دیکھ کر تو اب لوٹ رہے ہوں گے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ کرپانیں سونت کر گیانو کے خون کا بدلہ لینے میں مصروف ہوں۔ آخر دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور چھٹی حس وائرلیس کا کام بھی کرتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بھی دہشت زدہ ہو کر کیمپوں میں جا چھپے ہوں اور بھاگتے وقت اپنے مال اور اسباب کی طرح اپنی جوان بیویوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہوں اور اب گیانو کا کوئی داماد ہی نہ ہو! گرنتھی نے بڑی دیر سوچنے کے بعد گھٹنوں پر سے سر اٹھایا تھا اور فیصلہ سنا دیا تھا کہ گیان سنگھ کی بیٹیوں اور دامادوں کو بلانے کی کوشش کرنا فضول ہے نہ کوئی ان تک پہنچ سکتا ہے اور نہ وہ یہاں تک آسکتے ہیں۔ راستے میں کئی دریا پڑتے ہیں اور ہر دریا کا پاٹ مگرمچھ کے منہ کی طرح کھلتا چلا جا رہا ہے اور پھر ان کا انتظار کرنے کے لئے وقت بھی کہاں ہے؟

گاؤں میں سکھ اور ہندو بھی مرتے رہتے تھے کہ کسی مذہب کا آدمی ہوسدا تو زندہ نہیں رہتا۔ یہ صرف ایک اتفاق تھا کہ میں نے اس سے پہلے کسی کی ارتھی اٹھتے ہوئے نہیں دیکھی تھی۔ میں حیران تھا کہ گرنتھی ایک ایک سکھنی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کیا کہہ رہا ہے؟ وہ گیانو کی کونسی خطائیں معاف کرنا چاہتا ہے؟ لوگوں نے بتایا تھا کہ ارتھی کے ساتھ پانی کا ایک گھڑا بھی جاتا ہے۔ مرگھٹ اور گاؤں کے درمیان ایک بڑی سی چٹان ہے' گھڑا اس پر توڑ دیا جاتا ہے' پانی چٹان کے جس حصے پر سے گزرتا ہے' خاک اور دھول صاف کر دیتا ہے۔ چٹان کے اردگرد پتھریلی زمین میں سے جھانکتی ہوئی گھاس پانی پی کر تازہ دم ہو جاتی ہے۔ گرنتھی سکھ عورتوں سے درخواست کر رہا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک گھڑا اٹھا کر ارتھی کے آگے چلے۔

دستور کے مطابق مرنے والے کی بیٹی' بہو یا بہن "آخری پانی" کا گھڑا اٹھاتی تھی اگر کوئی ایسا ہی لاوارث ہو تو پتنی کے سوا کوئی بھی سردارنی مرنے والے کی یہ سیوا کر سکتی تھی گیانو کی بہن نہیں تھی' بہو کا منہ دیکھنا اس کے نصیب میں نہیں تھا' رہی بیٹی تو نہ جانے وہ کس حال میں تھی اور کہاں بیٹھ کر اپنے باپو کے لئے دعا کر رہی تھی کہ وہ لمبی عمر پائے' پرماتما اس کی رکھشا کریں۔ واہگورو اسے ہر مصیبت

سے بچائے رکھیں۔ اس بیچاری کو کہاں معلوم تھا کہ اس کے باپو کی ارتھی صرف اس لئے پڑی ہے کہ کوئی سردارنی' اس کے نام کا گھڑا اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بوڑھیاں کمزور تھیں اور نوجوان خوفزدہ

گرنتھی نے نیلی پیلی اودی اوڑھنیوں میں منہ چھپاتی ہوئی سردارنیوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا تھا' منہ ہی منہ میں تھوڑی دیر کچھ پڑھا تھا اور برسوں پرانی روایت توڑ دی تھی۔ اس نے گھڑا اٹھا کر اپنے کمزور کاندھے پر رکھ لیا تھا۔ وہ اپنے دوست کو آخری پانی سے محروم نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر کئی ایسے سکھ بھی گھروں سے نکل آئے تھے جنہوں نے گیانو کے قتل کی خبر سنتے ہی اپنے دروازے بند کر لئے تھے۔ ان کی مائیں اور بہنیں ان کے کرتے پکڑتی رہ گئی تھیں اور وہ دروازے کھول کر ارتھی کے ساتھ چلنے لگے تھے۔

گاؤں سے کچھ فاصلے پر سفید پتھروں کی ایک پہاڑی کے دامن میں مرگھٹ تھی' ادھ جلے کنکر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ گیانو کی لاش کے اوپر بھی ٹیڑھی میڑھی لکڑیاں جوڑ دی گئی تھیں۔ چاروں طرف منتظر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گرنتھی نے مسلمان بچوں اور جوانوں پر ایک نظر دوڑائی تھی جو آج صرف تماشہ دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ ان کا کوئی بزرگ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں شاید انتقام کی رگ زور سے پھڑکی تھی کہ اس کا ہاتھ چتا کی طرف مشعل کو بڑھاتے ہوئے رک گیا تھا۔ اس نے گھوم کر ایک ایک نوجوان کو چہرہ غور سے دیکھا تھا' اس کی مایوس آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ ان میں وہ چہرہ نہیں ہے جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی نراس نگاہیں پہاڑیوں' وادیوں اور ڈھوکوں پر سے ہو کر گیانو کے پاس پہنچ گئی تھیں۔

گرنتھی نے چتا کے چاروں طرف گھوم کر اسے آگ دکھائی تھی' تیل میں بھیگی ہوئی لکڑیوں نے چر چرا کر آگ پکڑی تھی۔ آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے تھے۔ شعلے بلند ہوئے تھے اور ان کی سرخی سرکشیدہ پہاڑ پر چھتری کی طرح چھائی ہوئی شفق میں مل گئی تھی۔ ایک لمحے کو ایسا لگا تھا کہ گیانو نے اٹھنے کی کوشش کی ہے پھر پٹاخہ چلا تھا اور پوری چتا ایک دہکتا ہوا انگارہ بن گئی تھی۔

کسی نے چتا کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ سب لوگ گیانو کے پھول وہیں چھوڑ گئے تھے۔

◆◆◆

خوف کا خشک سمندر

وہ دفتر سے نکلا تو شام کا رنگ گہرا ہو چکا تھا۔ کچے راستے پر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی جو اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کے جسم میں سرد لہریں چلنے لگیں۔ اس کے قدم تیز ہو گئے اور وہ اپنی پھولتی ہوئی سانس کے ساتھ اپنے ہی قدموں سے اڑنے والی دھول پھینے لگا۔

''نہ جانے محکمے والوں نے کیا سوچا کہ ایسے ویرانے میں دفتر کھول لیا۔ آبادی کا دور دور تک نشان نہیں ہے۔ سڑک بننے میں برس ڈیڑھ برس لگ جائے گا۔ اگر افسر لوگوں کو بھی کچے راستے پر چلنا پڑتا اور دھول پھانکنا ہوتی تو پھر دیکھتا کہ اس جگہ دفتر کیسے بنتا؟ ان کے پاس تو مفت کی کاریں ہیں۔ شیشے چڑھا کر زن سے نکل جاتے ہیں۔ پرانے ملازموں کے پاس بھی موٹر سائیکلیں ہیں۔ وہ بھی بچ بچا کر دھول کا یہ دریا عبور کر جاتے ہیں۔ تنہا ایک میں ہوں قدم قدم چل کر ڈیڑھ میل کا کچا راستہ دن میں دو بار طے کرتا ہوں۔''

وہ بھی مجبور تھا۔ سرکاری نوکری کے پہلے پانچ مہینوں میں کوئی ملازم سائیکل تو کیا جوتی بھی نہیں خرید سکتا۔

شروع شروع میں ایک دن اس نے سب کے ساتھ چھٹی کر لی تھی۔ پکی سڑک تک پہنچتے پہنچتے بھوت بن گیا تھا۔ بس میں بیٹھا تو کئی مسافر اس کی صورت دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔ اس نے آستین سے چہرہ پونچھنے کی کوشش کی تھی مگر دھول تو جیسے اس کے مساموں میں جڑ گئی تھی۔ گھر پہنچا تو آئینے میں بھی اپنی صورت نہ پہچان سکا تھا۔ انسان کو ویسے بھی اپنا چہرہ کبھی یاد نہیں رہتا' آنکھیں بند کر کے ہزار سوچو دوسروں کے چہرے ذہن میں گھوم جائیں گے مگر اپنی صورت کے خدوخال نمایاں نہیں ہوں گے۔ مصور بھی آئینہ سامنے رکھے بغیر اپنی تصویر نہیں بنا سکتا مگر یہ کیا کہ آئینے میں بھی اپنی صورت نہ پہچانی جائے۔

وہ دن اور آج کا دن' اس نے دھول سے بھڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ تنخواہ کا دن تھا اور ساڑھے تین بجے تک کیشیئر بینک سے نہیں لوٹا تھا۔ دفتر میں سب لوگ پریشان ہو گئے تھے۔ تین بجے تو وہ کام کاج چھوڑ کر اس کی راہ دیکھنے لگے۔ پریشانی بڑھی تو انتظار نے اندیشوں کا روپ دھار لیا۔

''آج کل تو آدمی ٹکے سیر بکتا ہے۔ ڈاکو دن دیہاڑے بینک لوٹ لیتے ہیں۔''

بے چارہ کیشیئر تو ویسے بھی مریل سا ہے پستول دیکھ کر کپڑے بھی اتار دے گا۔''

''صاحب نے بینک سے معلوم کیا ہے وہاں سے ساڑھے بارہ بجے نکل آیا تھا۔''

''نہ جانے کس سالے نے اسے کیشیر مقرر کیا تھا' ضرور سفارشی ہوگا۔''

''آج کل سفارش کون سنتا ہے' کسی کی مٹھی گرم کی ہوگی۔''

''یوں نہ کہو' ابھی اتنی مروت باقی ہے کہ کرسی کرسی کی سفارش سن لیتی ہے۔''

گھڑی کی سوئیاں کولہو کے بیل کی طرح اپنے چکر میں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ کمرے میں جیسے دھول بھر رہی تھی اور کیشیر کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ساڑھے تین بجے وسوسوں اور اندیشوں نے محمود و ایاز کو یکجا کر دیا تھا۔ افسر بھی اپنے کمروں سے نکل کر ماتحتوں میں مل گئے۔ کچے راستے پر گرد کی چادر تنتی تو افسر اور ماتحت ایک ساتھ آنکھیں پھاڑ کر اس میں جھانکنے کی کوشش کرتے اور جب کیشیر کی بجائے کوئی اور شخص برآمد ہوتا تو وہ ایک دوسرے کو یوں دیکھتے جس طرح زلزلے کے پہلے جھٹکے پر ہر شخص دوسرے کو سوال بن کر تکتا ہے۔

کیشیر آیا تو بہت سی آوازیں ایک ساتھ حملہ آور ہو گئیں۔ اس کے نام کے ساتھ کچھ گالیاں بھی گھل مل جاتیں مگر محمود کی موجودگی میں ایاز کی زبان کتنی کھل سکتی ہے۔ کیشیر کا تھیلا صحیح سالم دیکھ کر صفیں بکھر گئیں۔ افسر کیشیر کو گھور کر اپنے کمروں میں چلے گئے اور ماتحت اس یقین کے ساتھ اپنی اپنی میز کے سامنے درج ہو گئے کہ آج تنخواہ ضرور بٹے گی۔۔۔۔۔۔ زندگی کے ایک بھی واپس نہ آنے والے مہینے کا معاوضہ۔۔۔۔۔۔ موت کے کنوئیں میں ایک ماہ اور زندہ رہنے کی سبیل۔

کیشیر نے نہ تو افسروں کے گھورنے کا نوٹس لیا اور نہ ماتحتوں کی بے چینی کا۔ اس نے گرد جھاڑتے ہوئے ایک ہی جواب دیا۔

''راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی اسے ٹھیک کرانے میں دیر ہو گئی۔'' کیشیر کو تنخواہ کی طاقت اور اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ تنخواہ اس کے تھیلے میں تھی اور تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔

فہرست میں اس کا نام سب سے نیچے تھا۔ کیشیر نے اس کے دستخط لے کر نوٹ گنے اور اس کی طرف یوں پھینکے' جیسے خیرات کر رہا ہو۔ اگر تنخواہ نہ ہوتی تو وہ کاغذ کے یہ نوٹ کیا' سونے کی ڈلی بھی پلٹ کر اس کے منہ پر دے مارتا' مگر یہ تو تنخواہ کی رقم تھی' وہ غصے کے ساتھ اپنی اہانت بھی پی گیا۔ کیشیر بھی اب عجلت میں تھا۔ اس نے اپنا موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا اور یہ جا اور وہ جا۔ اندھیرا اترتے دیکھ کر شاید وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اب تو صرف اس کی اپنی تنخواہ اس کے پاس تھی۔

سردیوں کی شام میں سناٹا رچا بسا ہوتا تھا اور جب شام اور رات ایک ہونے لگیں تو ویرانے میں خاموشی کی ہیبت دہلانے لگتی

ہے۔آج تو وہ مزدور بھی جا چکے تھے جو سیوریج کے لئے نالہ کھودتے اور پائپ بچھاتے تھے۔آج ان کی تنخواہ کا دن تھا اور وہ مہینے کا خرچہ پہنچانے کے لئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ان کے لئے بھی تو یہ بڑا دن تھا۔اس نے اپنی تنخواہ ٹٹولی۔راستے کے آس پاس بڑے بڑے پائپ مگرمچھوں کی طرح منہ پھاڑے پڑے تھے۔''ہر پائپ میں ایک دو لٹیرے مورچہ بند ہو سکتے ہیں۔'' یہ سوچ کر اس نے جھرجھری لی اور ان چور قدموں کی چاپ اونچی ہوگئی' جو اس کا تعاقب کر رہے تھے۔اس نے ایک دو بار پلٹ کر دیکھنے کا ارادہ کیا مگر اس کی گردن اپنی جگہ اکڑی رہی' مڑ کر دیکھنے میں رفتار خود بخود سست پڑ جاتی ہے اور اسے تو چور قدموں سے پہلے پکی سڑک پر چڑھنا تھا۔

''ریس میں جیتنا ہے تو یاد رکھو' آگے بھاگتے چلے جاؤ' پلٹ کر دیکھو گے تو پتھر کے ہو جاؤ گے' سب سے پیچھے رہ جاؤ گے' کامیابی صرف آگے ہوتی ہے' پیچھے تو صرف کہانیاں ہی کہانیاں رہ جاتی ہیں۔''

اسے ڈرل انسٹرکٹر کا لیکچر بہت دنوں بعد یاد آیا تھا۔وہ قصے کہانیوں کا سخت مخالف تھا جب بھی اسے بیزاری کا اظہار کرنا ہوتا تو ضرور کہتا۔''چھوڑو یار قصے کہانیاں' کوئی کام کی پکی بات کرو۔'' اس وقت سچ یہ تھا کہ وہ دوڑ نہیں سکتا تھا۔اس کی ٹانگوں میں جیسے سیسہ بھر گیا تھا۔اچانک اسے احساس ہوا کہ ٹانگوں کا قصور نہیں ہے۔بھاگنے کے لئے تو دونوں ہاتھوں سے ہوا میں چپو چلانا ہوتا ہے اور اسکے دونوں ہاتھ جیب پر جمے ہوئے ہیں۔

ایک پائپ میں کوئی چیز سرسرائی' وہ یوں اچھلا جیسے سانپ پر پاؤں پڑ گیا ہو۔اچھلا' سمٹا اور پسینے پسینے ہو گیا۔اسے چند قدم پر بیمار کتے کا سایہ دکھائی دیا۔وہ اسے ہر روز پائپوں کے ارد گرد رینگتے دیکھتا تھا۔پاس پڑوس کے کتے اسے دیکھ کر بھونکتے تو وہ گھسٹ کر قریب کے پائپ میں گھس جاتا۔مگر آج اس کمزور کتے نے بھی حیران ہو کر دیکھا' جیسے سوچ رہا ہو۔''اچھا تو ہم سے بھی کوئی ڈر سکتا ہے۔'' اس نے شاید انگڑائی لینے کی کوشش بھی کی اور کچھ بھونکا بھی مگر نقاہت کے مارے اس کی بھونک رقیق ہوگئی۔''وہ مجھ پر بھونکا کیسے؟ اسے اتنی جرات کیسے ہوئی؟ میرے جسم نے ہی چغلی کھائی ہوگی۔'' اس نے کہیں پڑھا تھا کہ کتا جب انسان کے جسم سے اٹھنے والی خوف کی بو سونگھ لیتا ہے تو شیر ہو جاتا ہے اس نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے سوچا۔''انسان کا جسم بھی کیا بے حیا چیز ہے۔کتنا ڈھانپو اور چھپاؤ' پھر بھی اپنے آپ کو ظاہر کرنے سے باز نہیں آتا۔اور کچھ بن نہیں پڑا تو خوف کی بو اڑا کر اس مار کھانے کی نشانی کو شیر کر دیا۔''

''نہ جانے سردیوں میں لوگ کہاں دبک جاتے ہیں؟ نومولود بچوں کی طرح کمبلوں میں لپٹے ہوئے بدن مگر انہیں لپیٹتا کون ہے'

ان کے اپنے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ؟ خیر یہ چند قدم دور تو آبادی۔ اب گھبرانے کی کیا بات ہے؟'' اس نے اپنی ہمت بڑھائی اور موڑ کاٹتے ہی رونق جیسے زمین سے اگنے لگی۔ ایک چھوٹے سے ریستوراں میں بچوں کا کورس گونج رہا تھا۔ ''میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے۔'' بس سٹاپ البتہ ویران تھا بس غالباً ابھی ابھی گزری تھی۔ وہ راستہ بدل کا ایک سینما گھر کے احاطے میں پہنچ گیا جہاں بہت سے لوگ تھے۔ چند لمحوں کی تنہائی نے اسے ہم جنسوں کے لئے کتنا ترسا دیا تھا' ٹکٹ کی کھڑکی کے سامنے بندھی ہوئی قطار میں شامل ہو کر اسے بڑا سکون ملا' وہ کھڑکی کے سامنے پہنچا تو ذرا ٹھٹکا۔ مگر نیلے شیشے میں سے ٹکٹ کلرک کے نصف چہرے کو گھورتا دیکھ کر اس نے کہا ''ایک ٹکٹ'' کلرک کا چہرہ تصویر کی طرح ساکت رہا۔ اس نے گھبرا کر بٹوا نکالا تو ایک سائے نے اس میں گھسنے کی کوشش کی۔ اس نے جلدی سے ایک نوٹ گھسیٹا بٹوا جیب میں رکھا' اس پر بائیں ہاتھ کا پہرہ بٹھایا اور دایاں ہاتھ کھڑکی میں ڈال دیا۔ بڑا نوٹ غائب ہو گیا اور ٹکٹ کے ساتھ تین چھوٹے نوٹ اور ریزگاری لے کر ہاتھ واپس لوٹا۔

اسے دروازے کے قریب ہی سیٹ مل گئی۔ وہ اس میں کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح گر گیا۔ وہ اتنا بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس جگہ کیسے اور کیوں آیا ہے؟ ہال کی بتیاں گل ہوئیں اور اسکرین روشن ہوئی تو اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ایک سایہ اچانک اس کے اوپر جھکا۔ شاید یہ وہی سایہ تھا جس نے اس کے بٹوے میں گھسنے کی کوشش کی تھی' یا جس کے قدموں کی چاپ اس کا خون خشک کرتی رہی تھی۔ وہ پھر سے تن کر بیٹھ گیا۔ اس نے کوٹ کی جیب پر بائیں ہاتھ کا پہرہ سخت کر دیا اور دائیں ہاتھ کی مٹھی بھینچ کر پتلون کی جیب میں بند کر دی۔ پردے پر رنگ رنگ کے سائے کوئی کہانی سنا رہے تھے مگر وہ سوچ رہا تھا کہ جس سائے نے اس کے بٹوے میں گھسنے کی کوشش کی تھی' وہ اس کے پیچھے تھا' اسے تو برابر والی سیٹ پر ہونا چاہیے تھا۔ وہ پچھلی قطار میں کیسے پہنچ گیا؟

انٹرول کی بتیاں روشن ہوتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا' پچھلی قطار ایک سرے سے دوسرے سرے تک خالی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سایہ تو کسی چیز کا ہوتا ہے اور اس نے سایہ خود دیکھا ہے وہ بے یقینی کی حالت میں باہر نکلا۔ پھیپھڑوں میں تازہ ہوا پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ خوراک کی تلاش میں اس کا معدہ اپنے آپ کو کھرچ رہا ہے۔ ''جب تک فلم ختم ہو گی تنور ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔ دو روٹیوں اور ایک پلیٹ سالن کے خریدار کے لئے اس سردی میں کون سکڑتا ہے؟ اس شہر میں اس کا انتظار کرنے والا ہے بھی کون؟ ------ شکنوں بھرا بستر' میلا سا کمرہ اور ایک آئینہ۔ تنہائی کے احساس نے اس کی بھوک اور چمکا دی۔ بلبلاتی آنکھوں نے اس کے قدموں کا رخ خوانچوں کی طرف موڑ دیا۔ مختلف تلتی بھنتی چیزوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے وہ ایک خوانچے کے سامنے رکا۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی میں بند بھیگے ہوئے نوٹ خوانچے والے کے حوالے کئے۔ بائیں ہاتھ سے آلو کی ٹکیاں اور نان لئے اور ایک طرف ہٹ کر دائیں ہاتھ سے

نوالے توڑنے لگا۔

نان کا ایک حصہ ابھی اس کے ہاتھ میں تھا کہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا' کئی سائے اس کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ان میں شاید وہ سایہ بھی تھا جس نے اس کے بٹوے میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔اس نے پہچاننے کی کوشش کی مگر سائے تو بھوتوں کی طرح گھٹتے بڑھتے اور صورتیں بدلتے رہتے ہیں۔چہرہ ابھی گول تھا اور ابھی لمبوترا ہو گیا۔ناک غائب تھی اور پل بھر میں پل کی طرح تن گئی۔ہاتھ کہیں نہیں تھی اور نکلے تو آندھی میں گھرے ہوئے درخت کی شاخوں کی طرح اچھلنے کودنے لگے۔سایوں کو دیکھتے دیکھتے اسے ابکائی آئی۔ اس نے بچا ہوا نان احتیاط سے ایک کونے میں رکھ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہال کی طرف بڑھ گیا۔بے خیالی میں اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو اس کے نان کے ٹکڑے پر دو بلیاں جھپٹ رہی تھیں مگر ان کا ایک ہی پنجہ ایک دوسرے پر اٹھا ہوا تھا' دوسرے سے انہوں نے اپنا اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔

فلم دوبارہ شروع ہونے میں دیر تھی۔وہ لابی میں آنے والی فلموں کی تصویری مناظر دیکھنے لگا۔ایک کوارٹر کی تصویر دیکھتے ہی اسے خیال آیا کہ آج وہ کرایہ بھی وقت پر ادا نہیں کر سکے گا۔کچی بستی پر تو سورج ڈوبتے ہی رات ٹوٹ پڑتی ہے۔اس کے کوارٹر کی بیوہ مالکن بھی سو گئی ہوگی۔وہ پانچ ماہ سے ایک کوارٹر کے نصف کمرے میں رہ رہا تھا۔کوارٹر کے دو تہائی حصے میں مالکن کا گھر تھا۔بڑے کمرے میں ایک اور اینٹ کی دیوار اٹھا کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔کوارٹر پختہ تھا اور نصف کمرہ اس کی ضرورت کے لئے کافی تھا۔سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کمرے میں پانی کا نل بھی تھا اور بجلی کا بلب بھی۔بوڑھی مالکن کی عنایت تھی کہ پیشگی لئے بغیر اسے اپنا کرایہ دار بنا لیا تھا۔وہ کئی مالکوں کے دروازے کھٹکھٹا کر اس کے سامنے پیش ہوا تھا' پہلے تو وہ مالکن کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا اس کے چہرے کی جھریاں سوکھی ہوئی ندیوں کی طرح تھیں جن کے کنارے پتھر بکھرے ہوئے ہوں مگر دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ دکھوں اور پریشانیوں نے اس کے چہرے کو سنگسار اور اسے عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا کر دیا ہے۔وہ اگر انکار بھی کر دیتی تو شاید اسے برا نہ لگتا۔مجبوری انسان کو حد سے زیادہ محتاط کر دیتی ہے۔مگر مالکن کی آنکھوں میں شفقت تھی۔اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور کمرے کی چابی اس کے حوالے کر دی۔اس کے بعد مالکن کی صورت اس نے کبھی نہیں دیکھی۔تنخواہ لے کر اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ پہلے مالکن کے دروازے پر دستک دیتا۔ہر مرتبہ مالکن کی بیٹی دروازہ کھولتی۔وہ شاید دروازے سے لگ کر کرائے کا انتظار کر رہی ہوتی۔دروازے کی اوٹ سے وہ مسکرا کر پوچھتی۔

"بابو صاحب! کرایہ دینے آئے ہیں؟"

ہر بار اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔ ''جی ہاں''

وہ کواڑ چھوڑ دیتی اور اس کے سفید بازو کی سرخ ہتھیلی اس کے سامنے پھیل جاتی۔ وہ روپے گن کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ دونوں کے ہاتھ ذرا سے چھوتے مگر چھونے کی حرکت لڑکی کا ہاتھ کرتا۔ نوٹ جھپٹ لینے کی بے تابی میں یا اس کا ہاتھ چھونے کی خاطر؟ ۔۔۔۔۔۔ یہ سوال وہ ابھی تک حل نہیں کر سکا تھا۔

دروازہ بند ہونے سے پہلے وہ چور نظروں سے لڑکی کو دیکھتا۔ وہ نوٹ گنتے وقت اپنے نچلے ہونٹ کے کونے کو دانتوں سے سہلاتی رہتی۔ اس کی نوٹ شماری کا منظر اس کے ذہن میں اور اس کے ہاتھ کا لمس اس کے جسم میں کئی دن گردش کرتا رہتا مگر کرایہ وصول کرنے کے بعد لڑکی بھی اس طرح غائب ہو جاتی جس طرح اس کی ماں۔ مہینہ بھر اس کی صورت نظر نہ آتی۔ کبھی کبھار ماں بیٹی کی مدھم سے گفتگو دیوار میں سے چھن کر اس کے کانوں تک پہنچتی مگر لفظوں کو پکڑنے کی کوشش میں وہ ہمیشہ ناکام رہتا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے دیوار سے کان لگا کر ان کی باتیں سمجھنا چاہیں تو اسے یوں لگا جیسے اس کے کان بڑے ہو گئے ہیں اور اگر اس نے کوشش جاری رکھی تو وہ ہاتھی کے کانوں کے برابر ہو جائیں گے۔ یوں بھی یہ کوئی اچھی حرکت نہیں کہ کسی کے گھر کی باتیں چرائی جائیں اور وہ بھی اپنے ہی لوگوں کے گھر کی۔ فلم کا دوسرا حصہ شروع ہونے کی گھنٹی بجی تو وہ ہال میں اپنی نشست پر جم کر بیٹھ گیا۔ اس کا بایاں ہاتھ چپ چاپ کوٹ کی جیب پر پہرا دے رہا تھا مگر دایاں ہاتھ سارے نوٹ خرچ کرنے کے بعد آزاد ہو گیا تھا وہ عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا تھا۔ اس نے بچی کھچی ریزگاری دائیں مٹھی میں بند کر دی اور یکسوئی سے فلم دیکھنے لگا۔ ہال کی بتیاں روشن ہونے سے پہلے اس نے پوری کہانی ڈھونڈ لی۔ وہ اس احساس کے ساتھ باہر نکلا کہ اس نے فلم کے دونوں حصے دیکھے ہیں۔ اب نہ کوئی سایہ اس کے تعاقب میں تھا اور نہ چور قدموں کی کوئی چاپ۔ دونوالے پیٹ میں کیا گئے' خوف کافور ہو گیا۔

''بھوک بھی کیا چیز ہے' دم بھر میں آدمی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔''

اس نے بس سٹاپ کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ ہو سکتا ہے تنہائی کے احساس نے اسے پژمردہ کر دیا ہو۔ لوگوں میں آ کر اس کی طبیعت آخر سنبھل ہی گئی تھی۔ تنہا آدمی بھی پیپل کے زرد پتے کی طرح ہوتا ہے جو گلاب کے ہرے بھرے پودے کے کانٹوں میں الجھ کر سوکھ رہا ہو۔ ہوا کی ہر لہر اسے زخمی کر کے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اسی جھونکے سے ڈرتا ہے۔ جس سے مست ہو کر گلاب کا پودا جھومتا ہے۔ بس سٹاپ پر منتظر مسافروں میں مل کر اس کے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بس آئی تو اس کا دروازہ مینڈک کے دہانے کی طرح کھلا اور اس نے سارے مچھر جھپٹ لئے۔ ان میں وہ بھی شامل تھا۔ اس نے دائیں ہتھیلی سے ریزگاری خرچ کر کنڈیکٹر کے حوالے کی اور کھڑکی کے بجتے ہوئے شیشے میں سے دوڑتی ہوئی سڑک' چلتے ہوئے درخت اور رینگتے ہوئے مکان دیکھنے لگا۔ پوری بس بول رہی

تھی۔انجن اور باڈی سے لے کر مسافروں تک۔مگر اس کے ذہن کی رفتار بس سے کہیں زیادہ تیز تھی۔وہ اپنے خیالوں کی لہروں پر دوڑا چلا جا رہا تھا بہت دور! لیکن ابھی کسی منزل پر نہیں پہنچا تھا کہ کنڈیکٹر نے کچی بستی کا نام لے کر اسے چونکا دیا۔

بس آگے بڑھ گئی تو اس نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اجنبی نظروں سے بستی کو دیکھا' چاند اس کے عین مقابل چمک رہا تھا۔ بستی نشیب میں تھی اور چاندنی میں ڈوبے ہوئے مکان دریا کی لہروں کی طرح بے ترتیبی سے ابھر اور پھیل رہے تھے۔اسے یہ نظارہ اچھا لگا۔اس کا جی چاہا کہ خیالوں کی اس لہر پر تھوڑی دیر چہل قدمی کرے جو بس سے بھی آگے نکل گئی تھی مگر تنخواہ کا بوجھ اس کے قدم روک رہا تھا۔اس کا بایاں ہاتھ بڑی مستعدی سے جیب پر پہرا دے رہا تھا۔وہ سڑک سے اتر کر بستی میں داخل ہوا اور نیم روشن گلیوں میں ٹھوکر کھائے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

مالکن کے دروازے کے قریب پہنچا تو اندر جانی پہچانی آواز گونجی۔''امی! بابو صاحب آگئے ہیں۔'' اس جملے نے اس کے قدموں کے ساتھ اس کی روح کو بھی تھام لیا۔وہ دن میں پہلی بار مسکرایا۔۔۔۔۔کوئی ایسا بھی ہے جو اس کے قدموں کی چاپ پہچانتا ہے اور اتنی رات گئے تک اس کا انتظار کرسکتا ہے۔

''بابو صاحب! امی بہت پریشان تھیں۔آج آپ بہت دیر سے آئے۔'' مالکن کی لڑکی دروازے سے لگ کر کھڑی تھی۔

وہ محسوس کرسکتا تھا کہ اس کی آواز میں سے اطمینان بوند بوند بن کر ٹپک رہا ہے۔اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔''آج دفتر میں کام بہت زیادہ تھا۔'' نہ جانے اس نے کیوں جھوٹ بولا تھا۔حالانکہ اس آواز نے اس کی دن بھر کی تھکن اور ساری شام کی کوفت دور کردی تھی۔وہ ہلکا پھلکا ہوگیا تھا اور پہروں باتیں کرسکتا تھا مگر وہ ایک شریف نوجوان تھا۔اس وقت بیوہ مالکن کی جوان بیٹی سے کیسے مخاطب ہوسکتا تھا۔اس نے دروازے کی چٹخنی اترنے کی آواز بھی سنی مگر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔وہ صرف اتنا ہی سوچ سکتا تھا کہ ابھی کل ستر اسی روپے ہی جمع ہوئے ہیں اتنی رقم میں ماں کو شہر بلا کر رشتے کی بات بھی نہیں چھیڑی جاسکتی۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو چاندنی اس کے سائے کے ساتھ اندر گھس گئی۔اس نے سوئچ آن کر کے کمرے کو روشن کیا۔دروازہ بند کر کے احتیاط سے چٹخنی چڑھائی اور کنڈے میں تالا اٹکا کر لمبا سانس لیا۔بستر میں بیٹھ کر زمین پر پاؤں پھیلا دیئے۔بٹوا نکالا اور روپے گننے لگا۔پورے دس کم تھے۔اس نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔پھر دائیں ہاتھ کو گھورا۔اس کی ہتھیلی پر سے ریزگاری کے نشان بھی مٹ چکے تھے۔تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا۔پھر اسی کے بازو کے زور سے دائیں ہاتھ کو چارپائی کے پائے پر مار کر چیخا۔''کم بخت چور کہیں کا۔''

◆◆◆

نیلے آسمان کا ٹکڑا

شادی کے تین سال بعد آج پھر وہ اس کے دروازے پر کھڑی تھی' اس کے ایک بازو پر سال سوا سال کا بچہ سوار تھا اور دوسرے میں اٹیچی کیس لٹک رہا تھا' اس نے باہر اندھیرے میں جھانک کر دیکھا' اس کا شوہر ساتھ نہیں تھا۔

شادی سے پہلے وہ اس کی تھی' اتنی زیادہ کہ وہ جسموں میں بجلی کی ایک ہی رو دوڑنے لگی تھی۔ وہ ہر شام پرندوں کے ساتھ مل کر سورج کو رخصت کیا کرتے تھے' انہوں نے آپس میں اتنے وعدے کئے تھے کہ باغ کے درخت بھی تعداد میں ان سے کم تھے یا شاید انہوں نے ایک ہی وعدہ کیا تھا جو برگد کے بوڑھے درخت سے بھی زیادہ پھیل گیا تھا۔ دو برس میں وہ ایک دوسرے کے لئے پیام مسرت بن گئے تھے۔ ان کی روحیں عہد و پیمان کی ساری حدیں پھلانگ گئی تھیں' وہ مل کر آنے والے دنوں کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ چھوٹے چھوٹے' میٹھے میٹھے' نیلے پیلے خواب جو زندگی اور محبت کو سینچ کر سرسبز رکھتے ہیں۔ آج ایک کے لئے کل دوسرے کے لئے آئینہ در آئینہ تا حد ابد۔

غزو اسکی چھوٹی بہن یاسمین کی کلاس فیلو تھی۔ رفتہ رفتہ ان میں دوستی اتنی بڑھ گئی کہ وہ کالج میں ''گھی کھچڑی'' مشہور ہوگئیں۔ پھر وہ ان کے درمیان کود پڑا اور یاسمین ان کی محرم راز بن گئی۔ وہ کبھی انہیں ہنسوں کا جوڑا کہتی اور کبھی نل اور دمنتی! ایک بار غزو نے اس سے کہا تھا۔ میری راج ہنس! تم جانتی ہو بیچاری دمینتی پر کیا گزری تھی؟

آخر تو آسمان مہربان ہوا اور دمینتی کو راجہ نل گیا' سب اچھا ہے جو انجام اچھا ہے' یاسمین نے آخری جملہ لہک کر ادا کیا تھا پھر منجمد ہو کر کہا تھا۔ غزو' تم نے کبھی سوچا ہے' دمنتی نے راجہ نل کو امر کر دیا تھا اور نہ اس جیسے ہزاروں راجے مہاراجے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں مل گئے' وہ تو ایک کمزور سا آدمی تھا پہلے وہ دیوتاؤں کا عاجز بن گیا۔ نائی کی طرح ان کی طرف سے شادی کا پیغام لے کر دمنتی کے پاس پہنچا' جب دمنتی نے دیوتاؤں پر آدمی کو ترجیح دی اور اسے اپنا لیا تو وہ جوئے میں سب کچھ ہار کر دمنتی کو بھی گھنے جنگل میں تنہا چھوڑ گیا' آخر دمنتی نے ہی اسے ڈھونڈھ نکالا۔ لافانی محبت تو دمنتی کی تھی۔ راجہ نل تو صرف ایک محبوب تھا' محض ایک استعارہ!

پھر غزو کی شادی ہوگئی' بارات اس کے ننھالی شہر سے آئی تھی۔ اس کے ماموں نے ایک کھاتا پیتا گھر دیکھ کر اس کا رشتہ پکا کر دیا تھا۔ شادی کے سارے مرحلے اتنی تیزی سے طے ہو گئے کہ وہ بس زخمی ہرن کی طرح ہراساں پھرتا رہا! کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ کر بھی کیا

سکتا تھا؟ دنیا میں ایک بہن کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا اور وہ بھی اس کی طرح ابھی طالب علم تھی۔

غزو کی ڈولی اٹھی تو وہ اس طرح بلک بلک کر روئی کہ سارا محلہ ماتم کدہ بن گیا تھا۔ بارات کے ساتھ آنے والی عورتیں بھی یوں رو رہی تھیں جیسے اپنی بیٹی کو وداع کر رہی ہیں' واپس آ کر یا سمین نے اس کی رخصتی کا منظر کھینچا تو وہ بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا مگر غیر کی دلہن کے آنسو اس کے دل کا دکھ تو نہیں دھو سکتے تھے۔

ایک دن یا سمین نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر زندگی میں وہ سب کچھ مل جائے' جو انسان چاہتا ہے تو جنت کی آرزو کون کرے گا۔ جنت تو انسانوں کی ان خواہشوں اور حسرتوں سے آباد ہے جو دنیا میں تشنہ رہتی ہیں۔ وہ عالم فاضل بن کے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی مگر اسے وہ اس وقت بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بالکل ماں جیسی اماں بھی تو کہا کرتی تھی کہ دنیا میں اگر کوئی چیز نہ ملے تو اس کا زیادہ غم نہیں کرنا چاہئے۔ اللہ میاں وہ جنت میں ضرور دیں گے۔ اس وقت وہ سوچا کرتا تھا کہ اللہ میاں نے وہ چیزیں بنائی ہی کیوں ہیں جو سب کو مل نہیں سکتیں؟ اللہ میاں نے دنیا ہی کیوں بنائی ہے؟ صرف جنت ہی بنا دیتا! اس نے خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں ڈالا ہے۔ انہیں شیطان کے حوالے کر دیا ہے کہ ہمت ہے تو جاؤ' ان میں جس کسی کا ووٹ لے سکتے ہو لے کے کھاؤ۔ اس نے شیطان کو وہ سارے حقوق دے دیئے جو کسی اپوزیشن لیڈر کے ہو سکتے ہیں' اللہ بڑا ہی جمہوریت پسند اور مصنف ہے۔ وہ اگر چاہتا تو شیطان کو دوزخ کے ایک گوشے میں قید کر دیتا۔ مگر اس روز تو اس نے اپنے آپ کو سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔ اس نے اٹھ کر یا سمین کو گلے لگا لیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی ماں کی بانہوں میں جھول رہا ہے۔

شادی کے بعد غزو کئی بار میکے آئی مگر یا سمین سے بھی ملے بغیر واپس چلی گئی' اب تو یا سمین اس کے نام سے چڑنے لگی تھی۔ چلو شادی تو مجبوری تھی اپنے باپ کی کابلی انار آنکھوں اور گدرائی ہوئی مونچھوں کے سامنے کیا بولتی! ماموں کی بھی عزت کا سوال تھا اور اس کی ماں بیچاری کیا کر سکتی تھی؟ اسے تو اپنی زندگی کے دکھ سمیٹنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ وہ بیٹی کی پسند کا نام بھی لیتی تو وہ مار پڑتی کہ اپنے رہے سہے دانت بھی کھو بیٹھتی! مگر اب ملنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ اس نے تو ایسی آنکھیں پھیری ہیں' جیسے ہمیں جانتی ہی نہیں ہے' جیسے اس نے ہمارے گھر کا راستہ دیکھا ہی نہیں ہے' جیسے اس کے پاؤں سے مہندی اتری ہی نہیں ہے۔ بڑے بڑے طوطا چشم دیکھے ہیں مگر غزو کا جواب نہیں ہے۔

آج وہ پھر اس کے گھر میں تھی۔ دروازے کھلتے ہی وہ اتنی بے تکلفی سے اندر داخل ہو گئی جیسے اس کا اپنا ہی گھر ہو' تین سال میں نہ کوئی بندھن ٹوٹا ہو اور نہ کوئی رشتہ مٹا ہو' تین سال ایک منجمد گلیشئر کی طرح ہوں' جو ایک ہی جگہ پڑا دھوپ سینک رہا ہے۔ اسے معلوم ہی

نہیں ہے کہ اس پر سے سورج کئی ہزار بار گزر گیا ہے مگر دن تو سورج کے ساتھ چلتے ہیں' گلیشئر کے ساتھ منجمد نہیں ہو جاتے۔

یاسمین گھر میں نہیں ہے' شہر سے باہر گئی ہے۔ یہ اطلاع بھی غزو کے قدم نہ روک سکی' وہ باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر آ گیا۔ غزو یاسمین کے کمرے میں اٹیچی کیس رکھ کر بچے کو پلنگ پر لٹا رہی تھی۔

امی نے بھی حد کر دی۔ اس نے دودھ کی بوتل نکالتے ہوئے کہا میرا انتظار کئے بغیر گاؤں چلی گئیں۔ شادی ہے نا میرے چچازاد بھائی کی۔ پڑھ لکھ گئے ہیں مگر شہری لڑکی سے بھی شادی کریں گے تو گاؤں میں! پتہ نہیں۔ انہیں کیا مزہ آتا ہے گاؤں کی گلیوں کی خاک پھانک کر! ہاں یاسمین کب تک آئے گی؟ وہ بھی تو اب تمہاری طرح لیکچرار ہو گئی ہے۔

وہ کل یا پرسوں آئے گی۔ پرسوں کا اضافہ اس نے اپنی طرف سے کر دیا تھا۔

شکر ہے تم تو گھر میں ہو ورنہ گاؤں جانے کے لئے ایسی گیلی رات سٹیشن پر گزارنا پڑتی۔

وہ حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ یاسمین کی غیر حاضری کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا' وہ بڑے اطمینان سے بچے کے کپڑے نکال کر ایک طرف رکھ رہی تھی۔ میرا بیٹا بھوکا ہوگا بیچارہ! اسٹیشن سے جو تانگہ ملا اس کے گھوڑے نے بھی شاید چرس پی رکھی تھی' ٹھمک چال سے گھنٹہ بھر میں گھر پہنچایا۔ وہاں تالہ پڑا تھا' تمہارے گھر تک پون گھنٹہ لیا کم بخت نے۔ ہمارا گھر اتنا دور تو نہیں ہے اس نے طنز کا تیر چلایا مگر وہ اس کے سر پر سے گزر گیا۔

اسی لئے تو تانگے کو کوس رہی ہوں' میری امی کے نئے گھر سے دس منٹ کا بھی راستہ نہیں ہے۔ وہ بچے کے لئے دودھ بنانے باورچی خانے میں چلی گئی' جاتے ہوئے اس نے باہر کا دروازہ دبا کے بند کیا' بارش سے اس کی لکڑی پھول گئی تھی۔

عجیب عورت ہے' اسے احساس ہی نہیں ہے کہ گھر میں میرے سوا کوئی نہیں ہے یہ تو گھر ہے' کھنڈر میں بھی عورت اور مرد تنہا ہوں تو!

وہ دودھ کی بوتل اچھالتی ہوئی کمرے میں آ گئی میرے بیٹے کی بڑی اچھی عادت ہے ابھی دودھ پی کے سو جائے گا اور صبح میرے بعد اٹھے گا۔ بڑی گہری نیند ہے اس کی ماشاءاللہ!

بچے نے اپنے ننھے منے ہاتھوں میں بوتل تھام لی اور ربڑ کا نپل چبا چبا کے دودھ پینے لگا۔ بچے کو مطمئن دیکھ کر اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔ وہ دوپٹے کو ہمیشہ سے ناپسند کرتی تھی۔ وہ اکثر کہتی تھی۔ عورت تو گنجی ہوتی ہی نہیں اور اسے دوپٹہ اوڑھا دیتے ہیں اور یہ مرد ہر طرف گنج چمکاتے پھرتے ہیں اور انہیں سر ڈھانپنے کو کوئی نہیں کہتا۔ بعض اوقات وہ باہر سے پریشان ہو کر آتی تو

سارا غصہ یاسمین پر نکالتی۔ یہ بھائی لوگ بھی عجیب ہیں' ہمیں تہذیب سکھاتے ہیں اور یہ گلیوں میں ٹانگ برابر چھوکرے ماں بہن کی گالیاں بکتے پھرتے ہیں انہیں کوئی نہیں ٹوکتا' تانگے والا بھی سواریوں کا لحاظ نہیں کرتا' گھوڑے کی مالکن کو بے نقط سناتا ہے' پتہ نہیں یہ بھائی لوگ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ کپڑے کی ایک کترن سے چھپتا ہی کیا ہے؟ اللہ میاں نے ساری عورتیں ایک سی پیدا کی ہیں۔ یہ بات ہر ماں کی اولاد جانتی ہے۔

مگر آج تو اس کی نظریں پروانے کی طرح ایک بچے کے گرد گھوم رہی تھیں جو لاکھوں کروڑوں بچوں ایسا ہی ایک بچہ تھا۔

تم نے بتایا ہی نہیں کیسا لگا تمہیں میرا بیٹا؟

اچھا ہے! شکر کرو کہ کچھ تم سے بھی لیا ہے اس نے' اس کا باپ تو سنا ہے کہ اونٹ کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی' اس کا دوسرا تیر بھی خطا گیا وہ تو اسے ناراض کرنا چاہتا تھا' غصہ دلانا چاہتا تھا' اسے لڑ بھڑ کر گھر سے نکال دینا چاہتا تھا۔

یہ بھی خوب ہے بچے پر نثار ہو رہی ہے اور اس کے باپ کو برا کہو تو قہقہے لگاتی ہے اس نے دل میں سوچا شاید وہ بچے کے باپ کو پسند ہی نہیں کرتی! پھر یہ بچہ؟ بچے ضروری نہیں کہ پسند کا نتیجہ ہوں' شادی کے بعد وہ تو ہو جاتے ہیں' چرندوں پرندوں کے ہاں تو نکاح کے بغیر ہو جاتے ہیں۔ بھیڑ بکری کے بچوں کو کہاں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا باپ کون ہے؟ مگر ہم تو انہیں ذبح کر کے کھا جاتے ہیں؟

بچے نے دودھ ختم کیا تو غزو نے اٹھا کر اسے سینے سے لگا لیا اور اس کے دونوں گالوں پر باری باری پیار کرنے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر پیار کے ساتھ وہ میٹھے میٹھے رس کے گھونٹ حلق سے اتار رہی ہے۔ وہ بچے سے جلنے لگا' اس کا جی چاہا کہ چپکے سے اس کی چٹکی لے لے مگر غزو اسے اپنی نظروں سے ہٹائے تو' وہ تو مرغی کی طرح اسے اپنے بازوؤں میں لئے بیٹھی تھی۔ وہ اپنے خیال پر خود ہی مسکرایا۔ غزو نے اس کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا وہ تو بچے میں گم تھی' اس سے الٹے سیدھے سوال کئے جا رہی تھی اور وہ اپنی توتلی زبان سے طوطے کی طرح جواب دے رہا تھا۔

تم کس کے بیٹے ہو؟

امی کا۔

تمہیں کون اچھا لگتا ہے ابو یا امی؟

امی!

بچے کی زبان سے امی کا لفظ سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھتا اور وہ اسے کھینچ کر چوم لیتی' انسان شاید کبھی بڑا نہیں ہوتا' بس کھلونے بدلتا رہتا ہے وہ غزو کی حرکتوں کو بڑی بیزاری سے دیکھ رہا تھا۔

کیا تمہیں بچے اچھے نہیں لگتے؟ اس نے ناراض سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اچھے تو لگتے ہیں مگر سکول میں اور وہ بھی کلاس روم میں! اس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔''

تمہارے بچے ہوں گے تو پوچھوں گی۔ غزو نے اتنی بڑی بات اتنی سادگی سے کہہ دی کہ اسے غصہ آ گیا۔ اس نے غزو کو گھورا تو بچے کے کپڑے بدل ہی تھی بچے کو رات کا جھولا پہنانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے تکیہ ہموار کیا۔ اس پر بچے کا سر رکھا اور اسے دھاری دار کمبل اوڑھا کر بیرا کبوتر بنا دیا وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ بچے کی صورت کیسے اتنی بدل گئی ہے کہ غزو اٹھی اور سن کر اس کے سامنے اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے اپنے جسم کی داد مانگ رہی ہے' اس سے کہہ رہی ہے' میں آج بھی سر سے پاؤں تک اتنی ہی خوبصورت ہوں جتنی کل تھی۔ مجھ میں کوئی فرق نہیں پڑا' میں وہی ہوں جسے دیکھ دیکھ کر تمہاری آنکھیں سیر نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اب اس کے جسم کی حرارت اپنے ماتھے پر محسوس کر رہا تھا۔ ذرا دیر کو اس کی نظریں جھک گئیں' پھر وہ سامنے کھڑی ہوئی عورت کا ایکسرے کرنے لگا' حیرت ہے تین سال کے بعد بھی ویسی کی ویسی ہے' ذرا بھاری ہو گئی ہے مگر وزن بھی ایک آبشار کی طرح ترتیب سے بڑھا ہے' آنکھیں جوں کی توں روشن ہیں' ہونٹ ابھی تک اچھوتے لگتے ہیں اور چہرہ اس کی سوچ کی لکیر خم کھانے لگی۔

اچھا تو' ہم چلے سونے' بیٹے کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں' نیند کا بڑا ہی ماتا ہے۔ غزو نے کھڑکی کے پٹ بند کئے اور پردہ کھینچ کر برابر کر دیا۔

وہ اسے یاسمین کے کمرے میں چھوڑ کر باہر آ گیا۔ شادی سے پہلے اسی کمرے میں وہ رات گئے تک یاسمین سے باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ جب تک جاگ سکتا تھا' جاگ کر ان کی کلکاریوں میں سے باتیں پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

بچہ شاید فوراً سو گیا' اسے تھپکنے کی آواز آہستہ آہستہ ڈوب گئی۔ گھر میں پھر خاموشی اتر آئی۔ بارش نے رات کو اور سوگوار کر دیا تھا۔ اس نے کمرے کی دیواروں پر نظر دوڑائی' وہ چونے کی تختیاں لگ رہی تھیں۔ ان پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا' ایک کونے میں پانی کی ہلکی سی تحریر تھی۔ پچھلی برسات میں جہاں سے چھت ٹپکی تھی' وہاں پانی اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ وہ بستر کی سلوٹوں پر لیٹ کر سوچنے لگا شفاف پانی بھی اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ندیاں بھی اپنے پیٹ میں پڑی ہوئی کنکریوں کو دھو دھو کر ان کا رنگ بدل دیتی ہیں۔ کیا غزو کے دل پر اس کی محبت کا کوئی نشان باقی ہے۔ غزو کے نام سے اس کے دماغ میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس کا ذہن ڈرے ہوئے گھوڑے کی طرح

قلانچیں بھرنے لگا۔اس کے سر پر جن بھوت بھنگڑا ڈالنے لگے! یادیں اس پر چاروں طرف سے حملے کرنے لگیں۔
یہ یادیں بھی کیا چیز ہیں۔اس نے کروٹ بدل کر سوچا گزرے ہوئے وقت کو قید میں رکھتی ہیں مگر جب جیل کی دیواریں مٹی میں مل جاتی ہیں تو یادیں کہاں جاتی ہیں؟ اگر وہ بھی خاک ہو جاتی ہیں تو جیتے جی کیوں تڑپاتی ہیں۔
وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تکیے الٹتا پلٹتا رہا۔ان کی نرم نرم گود میں سر مارتا رہا لیکن نیند تو آج اس کی آنکھوں سے اڑ گئی تھی' اس کے خیال کی ہر لہر دیوار سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچ رہی تھی' کیا دیوار واقعی پختہ ہے؟ کہیں میرے خیالات غزو کو جھنجھوڑ تو نہیں رہے۔وہ گھبرا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ بھنورا خوشبو پر آتا ہے اور پرندہ رنگ پر گرتا ہے۔یہاں نہ تو خوشبو ہے اور نہ رنگ؟ پھر میں کیوں حواس باختہ ہوں؟ ایک زبردستی کی مہمان کی وجہ سے ایک نہیں دو' ایک اچھلتے بولتے گوشت کا لوتھڑا بھی تو ہے۔
اس نے کئی بار سوچا کہ غزو یہاں نہیں ہے۔وہ تو کبھی آئی ہی نہیں۔اس نے جو دیکھا تھا' وہ نظر کا فریب ہے' تنہائی کی ہمزاد ہے یا سناٹے کا سایہ ہے مگر ساتھ کے کمرے میں بچے کو کون تھپک رہا تھا؟ اس نے جی جان سے دعا کی کہ یہ عورت پانی بن کے بہہ جائے' بھاپ بن کے اڑ جائے یا کھڑکی سے کود کر چپ چاپ چلی جائے اور کچھ نہیں ہوتا تو یاسمین ہی آ جائے اور اسے دھکے دے کر نکال دے۔
اس نے جھنجھلا کر فیصلہ کیا کہ اس وقت غزو اس کے پاس آئی تو وہ اسے دھتکار دے گا' یوسف کی طرح' پورن بھگت کی طرح قادر یار کی طرح۔انہوں نے زلیخا' لوناں' اور رضیہ کو اس لئے جھڑک کر جھٹک دیا تھا کہ وہ کسی اور کی بیویاں تھیں' کسی اور کی امانت تھیں' یہ جیتی جاگتی عورتیں امانت کیسے بن جاتی ہیں۔امانت تو وہ ہوتی ہے' جس کے ہاتھ پاؤں نہ ہوں' جو بے جان ہو' روپے پیسے' ساز و سامان اور ایمان کی طرح! غزو اگر امانت ہے تو وہ میرے پاس چل کر کیسے آئی ہے؟ اس کا مالک کہاں ہے؟ کیا وہ اس کے لئے دال چاول بن گئی ہے؟ کیا یہ اس کی بے نمک امانت میری چھت تلے سو رہی ہے؟
عورتوں کی محبت اور حسن کی ہتک کی جائے تو وہ انتقام لینے پر بھی تل جاتی ہیں' زلیخا نے لوناں نے اور رضیہ نے کیسا سخت انتقام لیا تھا' کسی نے جیل میں ڈلوا دیا اور کسی نے کنویں میں پھنکوا دیا تو کسی نے جنگلوں کی خاک چھنوائی! اور یونان کی ایک ملکہ فیدرا بھی تو تھی' لوناں کی طرح وہ بھی اپنے سوتیلے بیٹے پر مرمٹی تھی' مگر وہ بڑی چھنال ہڈی تھی' جب محبوب ہاتھ نہ آیا تو اسے قتل کر دیا اور اپنے گلے میں پھندا ڈال کے خودکشی کر لی' وہ نہ ایک کی امانت رہی اور نہ دوسرے کو امانت بنانے کے جھنجھٹ میں پڑی۔
یہ سب قصے ایک جیسے ہیں؟ کیا انسان ہر جگہ ایک ہی طرح سوچتا رہا ہے' اگر سوچ ایک جیسی ہے تو دنیا شطرنج کی بساط کیوں بنی

ہوئی ہے' کوئی پیادہ ہے کوئی وزیر اور کوئی بادشاہ! شاید سبھی پیادے ہی ہیں۔ بادشاہ قلعے سے باہر نکلتا ہے تو گھوڑا ڈھائی گھر چل کے اسے مار دیتا ہے؟ اگر بادشاہ بھی مر جاتا ہے تو پھر وہ بادشاہ کیسا ہے؟ قلعے میں تو بادشاہ ہی ہے نا۔ میں بھی اپنے قلعے میں ہوں' مجھے اس سے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ کیا خبر کوئی گھوڑا یا کوئی بشپ میرے انتظار میں ہو' مجھے مات دینے کے لئے؟

غزو میرے پاس کیا لینے آئی ہے؟ تین سال میں اس نے کبھی پلٹ کے خبر ہی نہیں لی۔ اب آئی ہے محبت جتانے دمنتی کی خالہ! مگر اس نے تو بیتے دنوں کی کوئی بات نہیں کی' اس نے کسی اشارے سے پرانے زخم کو ہرا نہیں کیا۔ اس نے تو یہ خواہش بھی نہیں کی کہ تھوڑی دیر بیٹھ کے باتیں کریں۔ اس نے تو میرے بارے میں کچھ پوچھا ہی نہیں' اس نے تو میرا نام بھی نہیں لیا۔ اگر اس کے ذہن کی سلیٹ صاف ہے تو اس نے کھڑکی کے پٹ کیوں بند کئے؟ ان پر پردہ کیوں کھینچا؟ بچے کی گہری نیند کا راز کیوں فاش کیا؟ اتنا کچھ کیا کم ہے' مگر میں تو کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ میرے پاس تو جوپیٹر دیوتا جیسی قوت نہیں ہے کہ بط بن کر لیدا کے پلنگ پر پہنچ جاؤں۔ یہ دیوتا لوگ بھی خوب تھے۔ ساری حرکتیں انسانوں کی سی کرتے تھے پھر بھی ان کے سامنے انسان بونے ہو جایا کرتے تھے مگر اب دیوتا لوگ کہاں ہیں؟ کس سیارے پر رہتے ہیں؟ ان کی زمین تو انسانوں نے چھین لی ہے' وہ ہزار طوفان اٹھائیں' زلزلے لائیں' وبائیں پھیلائیں' انسان تو قطب صاحب کے مینار کی طرح زمین میں گڑ کر کھڑا رہے گا۔ اپنے خیالات کی رو بدلنے سے وہ ذرا سا پرسکون ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سوچا۔ میں اچھا انسان ہوں' اپنے ہی گھر میں چور بنا بیٹھا ہوں' عقل کے جال میں پھنسا ہوا' خوف اور احتیاط کی گٹھڑی بنا ہوا۔

اس کے ہاتھ کبھی ٹھنڈے پڑ جاتے اور کبھی اتنے گرم کہ لگتا بستر میں آگ بھری ہے اس کی سانس حلق سے نیچے اترتے ہوئے ڈر رہی تھی' شاید اس کے سینے میں گھومتے ہوئے جذبات سے خوفزدہ تھی' کھڑکی کے باہر پھیلے ہوئے درخت سے پتہ بھی گرتا تھا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھتا تھا۔ اس کے کان بج رہے تھے' وہ جانے کہاں کہاں سے آوازیں پکڑ کر لاتے تھے' گھر میں تو مکمل خاموشی تھی اور دیواروں کے کان ہوتے ہیں زبان نہیں ہوتی' وہ اپنے اندر پھیلی ہوئی بے چینی پر حیران تھا۔ اس نے ایک دوبار اپنے آپ کو جھڑکا' اپنے آوارہ خیالوں کو سرزنش کی' اس نے تکیے کو سہلاتے ہوئے سوچا مور کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس کے پاؤں کتنے بدصورت ہیں تو وہ انہیں فوراً خوبصورت جرابوں میں چھپا لے' مگر مور کے تو ہاتھ ہی نہیں ہوتے' جراب پہننے کیلئے ہاتھ ضروری ہیں' میرے تو ہاتھ ہیں مگر جراب کہاں ہے؟ یہ رات اتنی لمبی کیوں ہے؟ سورج دوسری دنیا میں اتنی دیر کیوں رہتا ہے؟ اس کی سوچ کی لہریں سوچ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں۔

وقت جیسے سوئی کے ناکے سے گزر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی پپڑیاں سرطان کی طرح پھیل کر اس کے حلق تک جا پہنچی تھیں۔ پیاس اس کے خون میں شامل ہو کر اس کے سارے بدن میں گھوم رہی تھی' اس کے سینے پر بھاری پتھر رکھا تھا۔ پیاس تو کوڑے مار مار کر انسانوں کو سراب کی طرف گدھوں کی طرح بھگاتی ہے مگر نہیں گدھا تو سراب کے دھوکے میں نہیں آتا۔ وہ بڑا سمجھدار جانور ہے صحرا میں گھر جائے تو پانی کی تلاش میں بھاگ بھاگ کر اپنی زندگی کے لمحے کم نہیں کرتا' چپ چاپ لیٹ کے مرجاتا ہے۔ مگر میں تو صحرا میں نہیں ہوں اپنے گھر میں ہوں' اپنے باپ دادا کے گھر میں' شاید باپ دادا کے خیال نے ہی مجھے بزدل بنا دیا ہے وہ اپنے اس گھر کی طرح جسے انہوں نے بڑی چاہ سے بنایا ہو گا' اپنی عزت بھی میرے سپرد کر گئے ہیں مگر وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں' وہ جس دنیا میں رہتے تھے' وہ ان کے ساتھ ہی دفن ہو گئی ہے' دنیا تو بڑی چیز ہے' ایک لمحے سے دوسرے لمحے میں آدمی بدل جاتا ہے پھر میں ان کی سوچوں کے پنجرے میں کیوں قید ہوں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا تو پلنگ کی چولیں چونک کر چیخ اٹھیں' وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔

اپنے آپ سے بہت دیر بحث کرنے کے بعد وہ ہمت کر کے نیچے اترا۔ اس نے کمرے سے قدم نکالا ہی تھا کہ اس کے دل کا ایکسلریٹر خود بخود دب گیا۔ اس کے سینے کی دھونکنی تیز ہو گئی۔ اس کے اعصاب کا جلترنگ بجنے لگا' یاسمین کے کمرے کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔

یہ دروازہ تو غزو ہمیشہ بند کر کے لیٹتی تھی' یاسمین اسے چھیڑا کرتی تھی۔ کس کا خوف ہے تمہیں کہ دروازہ بھیڑ کر چٹخنی بھی چڑھا دیتی ہو۔ کسی کا بھی نہیں' بس رات کو دروازے بند ہوں تو حفاظت اور سکون کا احساس ہوتا ہے وہ جواب میں ہمیشہ یہی جملہ دہرا دیتی تھی۔

وہ اتنی احتیاط سے یاسمین کے کمرے کی طرف بڑھا جیسے کانچ کے فرش پر چل رہا ہو' ذرا زور سے پاؤں پڑا تو سارا گھر ایک چھناکے سے جاگ اٹھے گا۔ پانچ قدم اس وقت پانچ کوس ہو گئے تھے' اس کے جسم پر انوکھا سا لرزہ طاری تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لے کر گردن بڑھائی اور اپنی آنکھوں پر جبر کر کے کھلے دروازے میں سے جھانکا۔

زیرو پاور کے بلب نے ہر طرف ہلکا ہلکا نیل بکھیر دیا تھا' ایسا لگتا تھا کہ چودھویں کے چاند سے روشن نیلے آسمان کا ٹکڑا ٹوٹ کر کمرے میں ڈھل گیا ہے۔

غزو اپنے بچے کو لپٹائے گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔